

شوال المکرم - ذوالحجہ ۱۴۳۸ھ
جولائی - ستمبر ۲۰۱۷ء

سرمایہ مکمل قرآن

مؤسس: ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور



وادی روح الی القرآن ہانی تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرہ آفاق دورہ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیان القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول سورۃ الفاتحہ و سورۃ البقرۃ مع تعارف قرآن

صفحہ 1: 360، قیمت 475 روپے

حصہ دوم سورۃ آل عمران تا سورۃ المائدہ

صفحہ 1: 326، قیمت 425 روپے

حصہ سوم سورۃ الانعام تا سورۃ التوبہ

صفحہ 1: 331، قیمت 425 روپے

حصہ چہارم سورۃ یونس تا سورۃ الکہف

صفحہ 1: 394، قیمت 475 روپے

حصہ پنجم سورۃ مریم تا سورۃ الحجۃ

صفحہ 1: 480، قیمت 575 روپے

حصہ ششم سورۃ الاحزاب تا سورۃ الحجرات

صفحہ 1: 484، قیمت 575 روپے

حصہ ہفتم سورۃ ق تا سورۃ الناس

صفحہ 1: 560، قیمت 650 روپے

(کامل سیٹ 3600 روپے)

یکے از مطبوعات: انجمن خدام القرآن خیبر پختونخواہ ساوہ

شائع کردہ: مکتبہ خدام القرآن لاہور

36-K، مال ناؤن لاہور فون 3-35869501 (042)

مَنْ عَمِلَ خَيْرًا فَلَهُ أَجْرٌ
مِنْ خَيْرِ أَجْرِي
(البقرہ: ۲۶۱)

حکمت قرآن

سمائی لاهور

شماره ۳

جلد ۳۶

شوال المکرم - ذوالحجہ ۱۴۳۸ھ جولائی - ستمبر ۲۰۱۷ء

بیاد:

ڈاکٹر محمد رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ - ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مدیر مسئول: ڈاکٹر البصیر احمد

ادارہ نصحیر:

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر - مؤمن محمود

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

ضمیر: حافظ عاطف وحید

نائب ضمیر:

حافظ خالد محمود خضر

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
کیے (الطبعات)

36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون 3-35869501

ویب سائٹ : www.tanzeem.org

ای میل : publications@tanzeem.org

سالانہ زیر تعاون : 240 روپے ، فی شمارہ : 60 روپے

اس شمارے میں

3	حافظ عاطف وحید	قرآن کی مرکزیت	حرفِ اوّل
5	ابو جعفر احمد بن ابراہیم الغرناطی	مِلَاكُ التَّأْوِيلِ ^(۱۰)	تذکر و تدبیر
19	افاداتِ حافظ احمد یار	ترجمہ قرآن مجید، مع صرفی و نحوی تشریح	فہم القرآن
35	پروفیسر محمد یونس جنجوعہ	انفاق فی سبیل اللہ اور قرضہ	حکمتِ نبوی
39	مجتبیٰ فاروق	قرآنی مکالمے: اسلوب، حکمت اور عصری معنویت	قرآنیات
51	محمد رشید ارشد	فلسفے کی مذہبی ضرورت	فکر و فلسفہ
56	پروفیسر حافظ قاسم رضوان	اسلام میں عورت کا مقام اور میاں بیوی کے باہمی معاملات ^(۲)	حُسنِ معاشرت
75	پروفیسر محمد یونس جنجوعہ	تعارف و تبصرہ	کتاب نما
96	Dr. Israr Ahmad	MESSAGE OF THE QURAN	بیان القرآن



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قرآن کی مرکزیت

عقل و نقل، تفکر و تذکر، تعلیم و تربیت اور تزکیہ و تحریک میں توازن پر انسانی شخصیت کے توازن اور نشو و نما کا انحصار ہے۔ قرآن حکیم کا بنیادی اور موضوعی مقصد معرفت رب اور عرفان ذات ہے اور اس کی تحصیل کا ذریعہ تعلیم، تربیت، تزکیہ اور عمل ہے۔ رسولوں کی بعثت کے اغراض و مقاصد بھی یہی بتائے گئے ہیں کہ وہ خدا رسی اور ادراک ذات کے ضمن میں تلاوت و تعلیم آیات، تعلیم حکمت، تعلیم شریعت اور تزکیہ و تربیت نفس کے مراکز اور مآخذ بنا کر بھیجے جاتے رہے ہیں۔ ﴿كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنْكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ﴾ (البقرة)

علم فلسفہ کے بنیادی مسائل میں سے مسئلہ وجود اور مسئلہ علم سرفہرست ہیں۔ جن لوگوں نے وجود باری تعالیٰ کا انکار کیا انہوں نے عمومی دلیل یہ دی کہ وہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا، عقل کی گرفت میں نہیں آتا۔ ظاہر ہے کہ یہ دلیل سراسر غیر معقول ہے اور ناقابل قبول ہے۔ اس لیے کہ سمجھ میں نہ آنا کسی شے کی نفی یا عدم کی دلیل نہیں۔ مسئلہ علم بھی اسی شتر گرگی سے دوچار ہے۔ فلاسفہ کو اقرار ہے کہ ہمارے مادی وجود میں دماغ اور ذہن بھی ہے جس کا وظیفہ تعقل اور یادداشت ہے۔ سوال یہ ہے کہ مادے کے اندر حرکت اور شعور کیسے پیدا ہو گیا؟ بے شعور سے شعور کیسے سرزد ہوا؟ کیا فلاسفہ اس کی وضاحت کر سکتے ہیں کہ اگر نیستی سے ہستی نہیں ہو سکتی اور عدم سے وجود نہیں ہو سکتا تو وجود مادی سے تفکر، تعقل اور شعور کیونکر سرزد ہوا؟ قرآن حکیم نے پہلی وحی میں ہی اس راز سے پردہ اٹھا دیا: ﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝۱ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۲ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝۳ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝۴﴾ گویا ایک وحدہ لا شریک ذات ہے جس نے مادے کو عدم سے تخلیق فرمایا ہے اور اسی نے مادی وجود میں علم کے غیر مادی کرنٹ بھی جاری فرمادیے ہیں: ﴿عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ (العلق) گویا وہی علت العلل ہے، بایں معنی کہ وہ علتِ اوّلیٰ ہونے کے ساتھ ساتھ ’الحکیم‘ بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حکمت کو ”خیر کثیر“ قرار دیا ہے: ﴿وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ﴾ (البقرة) حکمت کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ اشیاء کی حقیقت کا ادراک کرنا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے معمولات میں اس دعا کو بھی شامل فرمایا کہ اَللّٰهُمَّ اَرِنِي حَقِیْقَةَ الْاَشْیَاءِ کَمَا هِيَ۔ گویا۔
گفت حکمت را خدا خیر کثیر ہر کجا ایں خیر را بینی گبیر!

بلاشبہ فلسفہ کا سطحی علم انسانی ذہن کو گمراہی اور الحاد کی جانب لے جاتا ہے، لیکن کیا فلسفے کا گہرا مطالعہ — جس میں تفکر و تعقل کے ساتھ ساتھ تذکر و تذکرہ کی آمیزش بھی ہو — ایسے ہی نتائج پیدا کرتا ہے؟ ہمارا گمان بلکہ یقین ہے کہ معاملہ ایسے نہیں ہے۔ قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ:

﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۝ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَمًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ ۝﴾

(آل عمران)

”یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے الٹ بھیر میں نشانیاں ہیں اُن ہوش مندوں کے لیے جو اللہ کو یاد کرتے ہیں اٹھتے بیٹھتے اور لیٹے، اور آسمان اور زمین کی خلقت میں غور و فکر کرتے ہیں۔“
گویا فکر یعنی تعقل اور ذکر یعنی عشق و محبت کا امتزاج ہی صاحبانِ خرد کا اصل طرہٴ امتیاز ہے۔ ع
فکر را کامل ندیدم جز بہ ذکر!

تحریک رجوع الی القرآن کا مرکزی خیال اسی قرآنی تشخص سے ماخوذ ہے۔ انسانی افکار اور اقدار کی بلندی اور سلامتی کی ضمانت بھی اسی امتزاج ذکر و فکر سے ہے۔ حتیٰ کہ تبدیلی کا کوئی مفید حوالہ اس امتزاج ذکر و فکر اور قرآنی مرکزیت کے بغیر بے معنی ہے۔ مرکزی انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام ہر سال منعقد ہونے والے ”رجوع الی القرآن کورسز“ کے نصاب میں قرآن کو مرکز و محور کی حیثیت حاصل ہے۔ قرآن کو درست مخارج و ادائیگی کے ساتھ اس طور سے پڑھنا کہ بڑی غلطیوں سے بچا جاسکے، عربی صرف و نحو کی ضروری تعلیم جو فہم قرآن کے لیے لازمی و لا بدی ہے، قواعد عربی کا متن قرآن پر اجراء اصول حدیث اور مطالعہ احادیث رسول ﷺ جو تفسیر قرآن کا اہم ترین ذریعہ ہے، قرآن حکیم کا وہ تحریکی فکر جسے تحریک رجوع الی القرآن کی اصل روح قرار دیا جاسکتا ہے اور محاضرات سیرت اور فقہ العبادات و معاملات اس کورس کے اہم مشمولات ہیں۔

صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن و بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ناامیدی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں بھی چراغِ سحری کی تلاش کا کام جاری رکھا اور ایسے اہل اور باصلاحیت رجال کا رکھو آمادہٴ عمل کرتے رہے جن کے خلوص اور سعی و جہد سے ظلمتوں اور ناامیدیوں کے بادل چھٹنے کی توقع کی جاسکتی ہو۔ ایسے باہمت اور پر عزم افراد کے لیے تحریک رجوع الی القرآن کا پلیٹ فارم ایک نعمت غیر مترقبہ کا درجہ رکھتا ہے۔



اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
”بیان القرآن“ کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

مَلَاكُ التَّأْوِيلِ^(۱۰)

تالیف: ابو جعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی
تلخیص و ترجمانی: ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن

سُورَةُ النِّسَاءِ

(۶۲) آیت ۱ :

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً﴾ (آیت ۱)

”اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور پھر اس سے اس کے جوڑے کو پیدا کیا اور پھر ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلادیں۔“

اور سورۃ الاعراف میں ارشاد فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا﴾ (آیت ۱۸۹)

”وہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور پھر اس سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ وہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔“

اور سورۃ الزمر میں ارشاد فرمایا:

﴿خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا﴾ (آیت ۶)

”تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور پھر اس سے اس کا جوڑا بنایا۔“

یہاں تین سوال پیدا ہوتے ہیں:

(۱) خَلَقَ اور جَعَلَ میں کیا فرق ہے؟

(۲) پہلی آیت میں خَلَقَ اور باقی دونوں آیات میں جَعَلَ کہا گیا؟

(۳) سورۃ الزمر کی آیت میں بجائے واو عاطفہ کے ”ثُمَّ“ کا لفظ لایا گیا؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ خَلَقَ کا لفظ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب کسی چیز کو پہلی دفعہ پیدا کیا جائے اور اس کے پیدا کرنے میں پہلے سے کسی موجود شے پر انحصار نہ ہو اور جَعَلَ اُس وقت استعمال ہوتا ہے جب اس سے قبل اس کا کوئی سبب موجود ہو۔ قرآن مجید میں جَعَلَ بمعنی خَلَقَ اسی وقت آیا ہے جب اس سے قبل کسی ایسی

چیز کا ذکر ہو کہ وہ اس سے صادر ہو رہا ہو یا اس کا سبب بن رہا ہو۔ بہت کم اس قاعدے سے ہٹ کر ان دونوں کلمات کا استعمال ہوا ہے جیسے سورۃ الانعام میں ارشاد فرمایا:

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ﴾ (آیت ۱)

”سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تاریکیوں اور روشنی کو بنایا۔“

ملاحظہ فرمائیں کہ آسمان اور زمین کا وجود نہیں تھا اور پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں عدم سے پیدا کیا اور اس بات کو بیان کرنے کے لیے خَلَقَ کا لفظ ذکر کیا اور ”ظُلُمٰتِ“ اور ”نُور“ سے پہلے جَعَلَ کا لفظ لایا گیا کہ یہ دونوں چیزیں اجرامِ فلکی پر انحصار کرتی ہیں۔

اسی طرح سورۃ حم السجدۃ میں پہلے زمین کو پیدا کرنے کا ذکر ہے۔ فرمایا:

﴿قُلْ اٰنْتُمْ كُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ﴾ (آیت ۹)

”کہہ دیجیے کہ کیا تم اس کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں پیدا کیا۔“

اس کے بعد اگلی آیت میں ارشاد فرمایا:

﴿وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا﴾ (آیت ۱۰) ”اور اس میں اوپر کی طرف پہاڑ بنائے۔“

اور سورۃ الزخرف میں ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُم مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ﴾ (۱۷)

”اور جس نے تمام جوڑوں کو پیدا کیا اور پھر کشتی اور جانوروں میں سے وہ کچھ بنایا جس پر تم سواری کرتے ہو۔“

یہاں بھی پہلے ایک مادے کا ذکر ہے اور پھر اس مادے سے سواری کے بننے کا ذکر ہے۔

اس تفصیل سے دونوں کلمات کے درمیان فرق بخوبی ظاہر ہو گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہر لفظ اپنی جگہ پر آیا ہے۔

دوسرا سوال سورۃ الاعراف کی آیت کے بارے میں تھا کہ وہاں ”جَعَلَ مِنْهَا زُجَجًا“ کہا گیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح سورۃ الانعام میں ”جَعَلَ“ کی توجیہ پیش کی گئی ہے اسی طرح یہاں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ایک روایت کے مطابق حضرت حواء کو حضرت آدم کی پسلی سے پیدا کیا گیا، یعنی ایک مادہ کا وجود پیدا کیا جا چکا تھا جو ان کی خلقت کا باعث بنا۔

سورۃ النساء میں حضرت حواء کے لیے بھی لفظ ”خَلَقَ“ لایا گیا تھا، وہاں ابتداء خلق اور اولیت کی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا۔ یعنی طبقہ اناث میں سب سے پہلے حضرت حواء کی تخلیق کی گئی۔

”جَعَلَ“ کے لفظ میں ایک اور بات کی طرف بھی اشارہ ہے اور وہ یہ کہ زوجیت میں سکینت اور اطمینان پایا جاتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دیا ہے (دیکھئے سورۃ الروم آیت ۲۱) اور

زوجیت ہی کثرتِ نسل کا باعث بنتی ہے، اس لیے یہاں ”جَعَلَ“ کا لفظ لانا مناسب تھا۔

تیسرا سوال سورۃ الزمر کی آیت سے متعلق تھا کہ وہاں بجائے حرفِ عطف (واو) کے ”ثُمَّ“ لایا گیا، جسے اُس وقت ذکر کیا جاتا ہے جب ایک چیز باعتبارِ زمانہ دوسری چیز کے بعد میں آئی ہو۔ جیسے کہا جائے:

”جَاءَ نَبِيٌّ زَيْدٌ ثُمَّ عَمْرُو“ ”میرے پاس زید آیا پھر عمر آیا۔“

یہاں ہم اس بات کی وضاحت کریں گے کہ بعض دفعہ ”ثُمَّ“ ایک دوسرے معنی میں بھی آتا ہے اور وہ یہ کہ کسی چیز کے مرتبہ اور شرف کو ظاہر کیا جائے۔

اب دیکھئے کہ یہاں دو عجیب باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک تو یہ کہ تمام نوعِ انسانی کو ایک شخص سے پیدا کیا گیا اور دوسرے یہ کہ خاص طور پر حضرت حواء کو نفسِ آدم ہی سے پیدا کیا گیا اور یہ خصوصیت صرف حضرت حواء ہی کو حاصل ہے، اور کسی دوسری عورت کو نہیں کہ انہیں حضرت آدم کی پسلیوں میں سے آخری پسلی سے پیدا کیا گیا۔ تو چونکہ یہ دونوں باتیں عجائبِ زمانہ میں سے تھیں اس لیے ”ثُمَّ“ کا لفظ لا کر دونوں نشانیوں کی اہمیت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے، تو یہاں زمانے کے اعتبار سے تراخی (یعنی بعد میں آنا) مقصود نہیں ہے بلکہ شرف و منزلت کے اعتبار سے ایک علیحدہ نشانی کا اظہار مقصود ہے۔

یہاں یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہوگا کہ ”ثُمَّ“ بعض دفعہ واو کے معنی میں بھی آتا ہے یعنی ترتیب مقصود نہیں ہوتی، وہ اس لیے کہ ہم اس کا صحیح مطلب واضح کر چکے ہیں کہ یہاں ”ثُمَّ“ کا مطلب ہی کچھ اور ہے، یعنی کسی چیز کے شرف و منزلت کا اظہار کرنا۔

اب ہم اس کی چند مثالیں ذکر کرتے ہیں تاکہ ہماری بات واضح ہو سکے۔ سورۃ طہ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَإِنِّي لَغَفَّارٌ لِّمَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدَىٰ﴾ (۴۶)

”اور میں بخشنے والا ہوں اُس شخص کو جو توبہ کرے، ایمان لائے، نیک عمل کرے اور پھر ہدایت یافتہ ہو۔“

زختری نے سورۃ حم السجدۃ کی یہ آیت بھی بطور مثال پیش کی:

﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا﴾ (آیت ۳۰)

”بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ ڈٹ گئے۔“

یہاں بھی دو باتیں بیان کی گئیں، اللہ کی ربوبیت کا اقرار اور اسلام پر استقامت۔ استقامت سے پہلے ”ثُمَّ“ کا لفظ لا کر اس بات کی طرف اشارہ ہو گیا کہ اسلام قبول کرنا ایک خیر ہے، لیکن پھر اس پر ڈٹے رہنا اس سے بڑھ کر خیر ہے، بلکہ اس کا مرتبہ بہت ہی اونچا ہے۔ سورۃ المدثر میں ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّهُ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ﴿١٨﴾ فَقِيلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿١٩﴾ ثُمَّ قِيلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿٢٠﴾﴾

”اس نے سوچا اور اندازہ لگایا، پس وہ مارا جائے، کیسے انداز لگاتا ہے، پھر وہ مارا جائے، کیسے کیسے

انداز لگاتا ہے۔“

زختری لکھتے ہیں کہ یہاں بد دعائیں ”ثُمَّ“ کا لایا جانا کیا معنی رکھتا ہے؟ تو میں کہوں گا کہ اس سے مراد یہ

ہے کہ اس کی دوسری کاوش پہلی کاوش سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ ایک شاعر نے کہا:
 أَلَا يَا أَسْلَمِي ثُمَّ أَسْلَمِي ثُمَّ أَسْلَمِي
 ”سنو! تمہیں سلام ہو، پھر تم پر سلام ہو، اور پھر تم پر سلام ہو!“

(اس شعر کا دوسرا بیت ہے:

ثَلَاثُ تَحِيَّاتٍ وَإِنْ لَمْ تَكَلِّمِي

”یہ تین سلام پیش خدمت ہیں چاہے تم بات نہ کرو۔“ از دیوان حمید بن ثور)

ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔ سورۃ البلد میں گھائی پار کرنے کی دو خصلتیں بتائیں: غلام کا آزاد کرنا، اور بھوک سے لاچار یتیم اور مسکین کو کھانا کھانا۔ اور اس کے بعد ارشاد فرمایا:

﴿ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ﴾ (۱۵)

”پھر وہ ان لوگوں میں سے تھا جو ایمان لائے، جنہوں نے صبر کی تلقین کی اور رحم کھانے کی تلقین کی۔“

اب یہاں بھی ”ثُمَّ“ کا لفظ لا کر ایمان کا تذکرہ کیا گیا۔ یہاں یہ تو مراد نہیں ہو سکتا ہے کہ پہلے غلام آزاد کرے، یتیم اور مسکین کو کھانا کھلائے اور پھر ایمان لائے، وہ اس لیے کہ ایمان ہو تو اس سے دوسری نیکیاں پھوٹی ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ یہاں زمانے کا اعتبار نہیں کہ کون سی چیز پہلے تھی اور کون سی بعد میں، بلکہ ایمان کا درجہ اور مرتبہ واضح کرنا مقصود تھا کہ وہ رتبے اور فضیلت میں مذکورہ نیکیوں سے بہت اعلیٰ و افضل ہے۔ بلکہ اگر پہلی دو نیکیاں نہ بھی ذکر کی جاتیں تب بھی ایمان کا ہونا کفایت کرتا۔ خلاصہ کلام یہ ہوا کہ سورۃ الزمر میں چونکہ انعام اور اکرام کا ظاہر کرنا مقصود تھا، اس لیے دونوں باتوں کے درمیان ”ثُمَّ“ لایا گیا۔ سورۃ الزمر کی آیت کو ایک دفعہ پھر ملاحظہ فرمائیں:

﴿خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَأَنزَلَ لَكُمْ مِنَ الْأَنْعَامِ ثَمَلِيَّةً أَزْوَاجًا﴾

اب اگر یہاں یہ کہا جائے کہ آیت کے آخری حصے میں ایک اور نعمت کا بھی تو ذکر کیا گیا ہے یعنی ”اور چوپاؤں میں سے آٹھ جوڑے اتارے“ تو اس ٹکڑے سے پہلے بھی ”ثُمَّ“ آنا چاہیے تھا تا کہ اس نعمت کی خصوصیت کا بھی اظہار ہو جاتا تو جواباً میں کہوں گا کہ یہ نعمت کوئی ڈھکی چھپی نہیں کہ اس کے لیے ”ثُمَّ“ کا لفظ لا کر خصوصیت کا اظہار کیا جاتا۔ ”ثُمَّ“ وہاں لایا جاتا ہے جہاں ایسی نعمت کا خصوصی اعلان مقصود ہو جس کی طرف عموماً دھیان نہ جاتا ہو۔ الحمد للہ کہ تینوں سوالوں کا وضاحت کے ساتھ جواب ہو گیا۔

(۶۳) آیت ۵:

﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَمًا وَارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ

وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا﴾ (۵)

”بے عقل لوگوں کو اپنا مال نہ دو کہ جس مال کو اللہ تعالیٰ نے تمہاری گزر بسر کے قائم رکھنے کا ذریعہ بنایا ہے“

ہاں اس مال میں سے انہیں کھلاؤ، پلاؤ اور لباس پہناؤ اور ان سے نرمی سے بات کرو۔“

اور پھر آیت ۸ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَإِذَا حَصَرَ الْقَصَمَةُ أُولُوا الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينُ فَأَرْزُقُوهُمْ مِنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا﴾ ①

”اور جب تقسیم کے وقت قربت دار یتیم اور مسکین آجائیں تو تم اس میں سے تھوڑا بہت انہیں بھی دے دو اور ان سے نرمی سے بات کرو۔“

یہاں سوال کرنے والا سوال کر سکتا ہے کہ پہلی آیت میں کھانے پینے کے ساتھ کپڑا دینے کا بھی ذکر ہے لیکن دوسری آیت میں اس کا ذکر نہیں ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ پہلی آیت میں ایسے لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے جو اپنے مال کے وارث تو بنے ہیں لیکن اپنی کم عقلی کی بنا پر اپنے ہی مال میں تصرف کا حق نہیں رکھتے اور یہاں ان کے اوصیاء (گارڈین) کو خطاب کیا گیا ہے کہ وہ انہیں اس مال میں سے اتنا دیں جو ان کے کھانے پینے اور کپڑوں کے لیے کافی ہو۔

دوسری آیت ایسے لوگوں کے بارے میں نہیں ہے بلکہ ورثہ مخاطب ہیں کہ جو خود میراث کے مالک ہیں کسی اور کا حق اس مال میں نہیں ہے۔ اور اگر تقسیم وراثت کے وقت ان کے غریب رشتے دار یتیم اور مسکین آجائیں تو ان کی تھوڑی بہت مدد کرنا ان کے لیے مستحسن ہے۔ چونکہ ان کا اصلاً اس مال میں کوئی حق نہیں ہے اس لیے انہیں کچھ دے دینا چاہیے کپڑوں کا مہیا کرنا ان پر لازم نہیں ہے البتہ اگر گنجائش ہو تو دے بھی سکتے ہو۔

(۶۳) آیت ۱۳ :

﴿وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾ ②

”اور جو اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی اطاعت کرتا ہے تو اللہ اسے ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔“

اور اس مضمون کی تیرہ (۱۳) مزید آیات ملاحظہ فرمائیں:

(۱) سورۃ المائدہ میں ارشاد فرمایا:

﴿فَاتَّبَعَهُمُ اللَّهُ بِمَا قَالُوا جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ﴾ ③

”ان کے اس قول کی بنا پر اللہ تعالیٰ انہیں بدلے میں ایسے باغات دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ ان لوگوں کی جزاء ہے جو احسان کرتے ہیں۔“

(۲) اور اسی سورت کے آخر میں ارشاد فرمایا:

﴿قَالَ اللَّهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾ ④

”اللہ ارشاد فرمائے گا: یہ وہ دن ہے کہ جس دن سچ بولنے والوں کو ان کا سچ فائدہ پہنچائے گا۔ ان کے لیے

ایسے باغات ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی جس میں وہ ابد الابد تک رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔“

(۳) سورة التوبة کی آیات ۸۸-۸۹ میں فرمایا:

﴿لَٰكِنَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ جَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۸۸﴾ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿۸۹﴾﴾

”لیکن خود رسول اور اس کے ساتھ وہ لوگ جو ایمان لائے اپنے مال اور اپنی جانوں سے جہاد کرتے ہیں انہی کے لیے بہلائیاں ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔“

(۴) سورة التوبة کی آیت ۱۰۰ میں فرمایا:

﴿وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ ۖ أُولَٰئِكَ مِنْهُمْ يُرَوِّجُونَ ۖ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ ۖ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۚ وَأَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿۱۰۰﴾﴾

”اور مہاجرین اور انصار میں سے وہ لوگ جنہوں نے پہلے پہل سبقت کی اور وہ لوگ جنہوں نے نیکی کے ساتھ ان کی پیروی کی تو اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے اور اللہ نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور جس میں وہ ابد الابد تک رہیں گے اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔“

(۵) سورة ابراہیم میں ارشاد فرمایا:

﴿وَأُدْخِلَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ ۖ﴾ (آیت ۲۳)

”اور جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے وہ ایسے باغات میں داخل کیے جائیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور جن میں وہ اپنے رب کی اجازت سے ہمیشہ رہیں گے۔“

(۶) سورة الکہف میں ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ مَنْ أَحْسَنَ عَمَلًا ﴿۱۰۰﴾ أُولَٰئِكَ لَهُمْ جَنَّاتٌ عَدْنٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ يَحْلَوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ.....﴾ (آیت ۳۱)

”یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے تو ہم کسی نیک عمل کرنے والے کا اجر ضائع نہیں کریں گے۔ ان کے لیے ایسے باغات ہوں گے جن میں وہ اقامت پذیر ہوں گے اور جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہاں انہیں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے۔“

(۷) سورة الحديد میں ارشاد فرمایا:

﴿بَشِّرْكُمْ الْيَوْمَ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿۱۶﴾﴾

”آج تمہیں خوشخبری ہو ان باغات کی جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔“

(۸) سورة المجادلة میں ارشاد فرمایا:

﴿أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ ۖ وَيُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۚ أُولَٰئِكَ حِزْبُ اللَّهِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٣٢﴾﴾

”یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان لکھ دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح کے ساتھ ان کی مدد کی ہے، اور انہیں وہ ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہی لوگ اللہ کا گروہ ہیں اور جان لو کہ اللہ کا گروہ ہی کامیابی حاصل کرنے والا ہے۔“

(۹) سورة الصف میں ارشاد فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿١٠﴾ تُوْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ ۖ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١١﴾ يَغْفِرُ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَيُدْخِلُكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَمَسْكِنٍ طَيِّبَةٍ فِي جَنَّاتٍ عَدْنٍ ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿١٢﴾﴾

”اے ایمان والو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت نہ بتاؤں جو تمہیں ایک دردناک عذاب سے بچا دے۔ تم اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جانوں سے جہاد کرو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جان لو۔ اللہ تمہارے گناہ معاف کرے گا اور تمہیں ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور ایسے صاف ستھرے گھروں میں جو ان باغات میں ہوں گے جو رہنے کے لیے ہیں اور یہی بڑی کامیابی ہے۔“

(۱۰) سورة التغابن میں ارشاد فرمایا:

﴿يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ۚ ذَٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ۚ وَمَنْ يُؤْمِن بِاللَّهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهِ وَيُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿٩﴾﴾

”جس دن وہ تمہیں اکٹھا کرے گا، اکٹھا ہونے کے دن، اور وہ ہر جیت کا دن ہے۔ اور جو شخص اللہ پر ایمان لاتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے، اللہ اس سے اس کی برائیاں مٹا دے گا اور اسے ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جن میں وہ ابد الابد تک رہیں گے، اور یہی بڑی کامیابی ہے۔“

(۱۱) اور سورة الطلاق میں ارشاد فرمایا:

﴿وَمَنْ يُؤْمِن بِاللَّهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ قَدْ أَحْسَنَ اللَّهُ لَهُ رِزْقًا ﴿١١﴾﴾

”اور جو شخص اللہ پر ایمان لاتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے اللہ اسے ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جن میں وہ ابد الابد تک رہیں گے اور اللہ نے اس کے لیے بہترین رزق تیار کر رکھا ہے۔“

(۱۲) سورۃ البروج میں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ الدِّیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنَّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ذٰلِكَ الْقَوْزُ الْكَبِیْرُ ۝﴾
 ”بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے ان کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور یہ بڑی کامیابی ہے۔“

(۱۳) سورۃ البریۃ (البیّنۃ) میں ارشاد فرمایا:

﴿جَزَاؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّٰتٌ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ۚ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۝﴾ (آیت ۸)

”ان کا بدلہ ان کے رب کے پاس ہے (اور وہ ہے) ایسے باغات جہاں وہ رہائش پذیر ہوں گے اور جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی جن میں وہ ابد الابد تک رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔“

سورۃ النساء کی آیت ملا کر یہ کُل چودہ (۱۴) آیتیں ہوں گی، ان سب میں ایک بات مشترک ہے اور وہ یہ کہ اہل ایمان کو آخرت میں ایک اچھا بدلہ دیا جائے گا، اور پھر اس جزا کی تفصیل بھی بیان کی گئی۔ ان آیات کے مضامین کو دیکھتے ہوئے چھ سوال ذہن میں ابھرتے ہیں:

- (۱) اکثر آیات میں خُلُود کا ذکر ہے، لیکن باقی باتوں میں کافی اختلاف ہے؟
- (۲) ان میں چار آیات ایسی ہیں جن میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے کے ساتھ ﴿رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ کا بھی ذکر ہے؟

(۳) اور چار آیات میں خُلُود کے ساتھ ”اَبَدًا“ کا اضافہ بھی ہے؟

(۴) سورۃ المجادلہ میں صرف ﴿رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ کا ذکر ہے ”اَبَدًا“ کا ذکر نہیں ہے؟

(۵) سورۃ المجادلہ کی آیت ان میں وہ واحد آیت ہے جس میں ”حِزْبُ اللّٰهِ“ کا ذکر ہے؟

(۶) سورۃ الطلاق کی آیت میں خاص طور پر ”اَبَدًا“ کا ذکر ہے؟

اب ان کے جوابات ملاحظہ فرمائیں:

- (۱) اکثر آیات میں خُلُود کا ذکر ہے، یعنی جنت میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، اور وہ اس لیے کہ جو نعمت ایک دن ختم ہو جائے وہ حقیقت میں نعمت نہیں ہے — اور ایسا ہی عذاب کے بارے میں بھی کہا جاسکتا ہے — اور اسی لیے نعمت کے ساتھ خُلُود کا ذکر کیا گیا۔

(۲) چار آیات میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور جنت میں ابد الابد تک رہنے کا خصوصی ذکر کیا گیا اور باقی دس آیات

میں دونوں چیزوں کا ساتھ ساتھ ذکر نہیں ہے تو اس ضمن میں یہ بات ملاحظہ ہو کہ سورۃ المائدہ (آیت ۱۱۹) میں خاص طور پر صادقین (سچ بولنے والوں) کا ذکر ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کی صداقت پر بھی مہر ثبت کی گئی ہے اور یہ صفت ایمان کی انتہائی اونچی صفات میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صادقین کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾ (التوبة)

”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچ بولنے والوں کے ساتھ ہو جاؤ۔“

یعنی انبیاء اور رسول علیہم السلام ہمیشہ سچے ہوتے ہیں اور اہل ایمان کو ان کا اُسوہ اختیار کرنا چاہیے۔

سورۃ التوبہ کی آیت ۱۰۰ میں مہاجرین اور انصار کا ذکر کیا گیا اور یہ بتایا گیا کہ یہ لوگ ایمان لانے والوں میں سب سے آگے آگے تھے اس اُمت کے محسنین کے سرخیل تھے اور اسی لیے رسولوں کی اطاعت کرنے والوں میں ان کا مقام بھی صادقین میں سے ہوتا ہے۔ اب جبکہ ان دونوں آیات میں ایسے لوگوں کا تذکرہ آ گیا جو دوسروں کے لیے قدوہ اور اُسوہ کی حیثیت رکھتے ہیں تو ان کے اوصاف کے بیان میں اللہ کی رضا، خود ان کی رضا اور جنت میں ہمیشہ رہنے کا تفصیلی تذکرہ کیا گیا۔ باقی آیات میں اہل ایمان کے اوصاف کا وہ تفصیلی تذکرہ نہیں ہے جو ان دو آیات میں دیکھا جاسکتا ہے البتہ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انہیں بھی جزا کے اعتبار سے یہ دونوں خوبیاں حاصل رہیں گی یعنی جنت میں ہمیشہ رہنا اور اللہ کی رضامندی۔ ہم اس سے پہلے سورۃ البقرہ کی آیت ۹۸ کا حوالہ دے چکے ہیں جہاں ملائکہ کا ذکر کیا گیا جن میں جبریل اور میکائیل شامل ہیں، لیکن ان دونوں فرشتوں کا پھر خصوصی ذکر بھی کیا گیا۔ ان آیات کو بھی اسی انداز میں دیکھا جائے۔

اب رہی سورۃ البُرَیْہَ (البُرَیْہَ) کی آیت کہ جہاں مؤمنین کے اوصاف کا ذکر نہیں ہے پھر بھی ﴿رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ﴾ اور جنت میں ابد الابد رہنے کا ذکر ہے تو اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ قرآن کی ترتیب کے اعتبار سے یہ وہ آخری جگہ ہے جہاں اہل ایمان کی اُخروی جزا کا ذکر ہے اور اس کے تقابل میں آگ کا عذاب پانے والوں کا بھی ذکر ہے، تو اس لیے اس آیت کو بھی پہلی دو آیات کا درجہ دیا گیا کہ اس میں اہل ایمان کے مجموعی حالات کی طرف اشارہ کرنا مناسب تھا۔

(۳) وہ چار آیات جن میں ﴿خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا﴾ کہا گیا، یعنی خلود اور ابدیت دونوں کو ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا اور باقی دس آیات میں صرف خلود کا ذکر کیا گیا۔

ہم سورۃ المائدہ اور سورۃ التوبہ کا ذکر تو کر ہی چکے ہیں کہ جہاں اہل ایمان کا تفصیلی تذکرہ ہے اللہ ان سے راضی ہوا، وہ اللہ سے راضی ہوئے، تو یہاں خلود کے ساتھ ابدیت کا ذکر بھی اسی تفصیل کا ایک رخ ہے۔

سورۃ الطلاق میں بار بار کئی چیزوں کی غایات (انتہا) کا ذکر ہے اور پھر عمومی طور پر بھی فرمادیا:

﴿قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا﴾ (۵)

”اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔“

تو جہاں کئی دوسری چیزوں کی انتہا کا ذکر کیا گیا تو مناسب تھا کہ جنت میں رہنے کے بارے میں بھی بتا دیا جاتا کہ یہاں ہمیشہ رہنے کی کوئی حد نہ ہوگی، بلکہ یہ رہائش ابد الابد کے لیے ہوگی۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی رضا کا ذکر نہیں کیا گیا کہ یہاں اہل ایمان کے وہ اوصاف نہیں بیان ہوئے جو المائدہ اور التوبہ کی دونوں آیات میں بیان ہوئے ہیں۔ اور جہاں تک سورۃ البریہ (البیتۃ) کی آیت کا تعلق ہے تو اس کا جواب پہلے آچکا ہے کہ وہاں فریقین (اہل ایمان اور اہل کفر) دونوں کی جزا کا بیان تھا، اس لیے ابدیت کا ذکر مناسب تھا۔

(۴) سورۃ المجادلہ کی آیت میں صرف رضا کا ذکر ہے ابدیت کا نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس سورت میں اہل ایمان کے وہ اوصاف بیان ہوئے ہیں جو انہیں ایک اعلیٰ مقام عطا کرتے ہیں۔ فرمایا:

﴿أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ﴾

”یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں میں ایمان کو لکھ دیا ہے اور پھر اپنی طرف سے ایک روح کے ساتھ ان کی مدد بھی کی ہے۔“

پھر فرمایا:

﴿أُولَٰئِكَ حِزْبُ اللَّهِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (۳)

”یہ اللہ کا گروہ ہے، اور سنو! بے شک اللہ کا گروہ ہی فلاح پانے والا ہے۔“

فلاح اور فوز کا میانی کے حصول کی طرف دلالت کرتے ہیں، اگر فوز کا ذکر آ گیا تو پھر ابدیت کے ذکر کی حاجت نہیں رہتی الا یہ کہ تفصیل مقصود ہو، اسی لیے سورۃ النساء، سورۃ التوبہ کی آیات (۸۸-۸۹)، سورۃ الحدید اور سورۃ المجادلہ کی آیات میں ابدیت کا ذکر نہیں، کیونکہ پہلی تین آیات میں ”فوز“ کا اور آخری آیت میں ”فلاح“ کا ذکر ابدیت کے ذکر سے کفایت کر جاتا ہے۔ سورۃ الطلاق کی آیت میں چونکہ نہ فوز کا ذکر ہے اور نہ ہی اس جیسے کسی دوسرے لفظ کا اس لیے وہاں ابدیت کا ذکر مناسب تھا۔

یہاں آپ سوال کر سکتے ہیں کہ سورۃ المجادلہ میں بھی تو اہل ایمان کا تفصیلی تذکرہ ہے، اور بقول صاحب کتاب کے جہاں تفصیل ہو وہاں ہر چیز کے بیان میں تفصیل مناسب رہتی ہے، تو یہاں بھی رضاء الہی کے ساتھ ابدیت کا تذکرہ کیوں نہ کیا گیا؟ ہم جواباً کہیں گے کہ یہاں ایسے اوصاف بیان ہوئے جن میں خصوصیت بھی ہے اور تفصیل بھی، تو ان پر ہی اکتفا کیا گیا۔

(۵) سورۃ المجادلہ میں ﴿أُولَٰئِكَ حِزْبُ اللَّهِ﴾ خاص طور پر کہا گیا؟

اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے کہ اس سورت میں پہلے ”حِزْبُ الشَّيْطَانِ“ کا تذکرہ ہے تو اس کے مقابلے میں ”حِزْبُ اللَّهِ“ کا تذکرہ مناسب تھا، اور پھر ان کی صفات میں ایمان کا ان کے دلوں میں لکھا جانا، اللہ کی خصوصی تائید کا حاصل ہونا، ان کا کامیاب ہونا، یہ ایسی صفات عالیہ تھیں کہ ان کے بعد ابدیت کے ذکر کی حاجت

نہ رہی، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔

(۶) سورۃ الطلاق میں خاص طور پر ابدیت کا ذکر ہے۔

اس کا جواب اوپر بیان ہو چکا ہے۔

اضافات از مترجم

سلف میں سے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب جہنم بالکل خالی ہو جائے گی، یعنی جہنم کی آگ جہنمیوں کو پوری طرح کھا جائے گی، اور اس کی دلیل میں سورۃ النبا کی یہ آیت ان کے پیش نظر رہی ہے:

﴿لَيَشِئْنَ فِيهَا أَحْقَابًا ۝۳۳﴾ ”وہ اس میں مدتوں پڑے رہیں گے۔“

لیکن جمہور سلف اور جمہور علماء اس بات کے قائل ہیں کہ جنت کی طرح جہنم بھی ابدی ہے۔ جنت اور جہنم دونوں کے باسیوں کے لیے ”خَالِدُونَ“ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ۳۹ مرتبہ جنتیوں کے لیے اور ۳۹ مرتبہ ہی اہل جہنم کے لیے استعمال ہوا ہے، اور اس عدد میں جنتیوں کے اوصاف میں جَنَّةُ الْخُلْدِ (الفرقان: ۱۵) اور يَوْمُ الْخُلُودِ (ق: ۳۴) اور جہنمیوں کے اوصاف میں دَارُ الْخُلْدِ (فصلت: ۲۸) شامل ہیں۔

خلود کے معنی کے بارے میں قرطبی لکھتے ہیں:

”خلود کا مطلب ہے ”باقی رہنا“ اور اسی لیے جنت کو ”جَنَّةُ الْخُلْدِ“ کہا گیا۔ مجازی معنوں میں لمبی مدت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جیسے کسی کو دعا دی جائے تو کہا جاتا ہے: خَلَّدَ اللَّهُ مُلْكَهُ: اللہ اس کی بادشاہت کو طویل کرے۔“

زہیر نے کہا:

أَلَا لَا أَرَى عَلَى الْحَوَادِثِ بَاقِيًا

وَلَا خَالِدًا إِلَّا الْجِبَالَ وَالرَّوَابِسَا

”سنو! حوادثِ زمانہ کو دیکھتے ہوئے میں نہ کسی کے لیے بقاء دیکھتا ہوں اور نہ ہی خلود سوائے پہاڑوں کے جو (زمین میں) گڑے ہوئے ہیں۔“

لیکن قرآن کی آیات میں یہ لفظ ابدیت کے معنوں میں ہے۔ ملاحظہ کریں کہ اہل جنت کے اوصاف میں ”أَبَدًا“ کے اضافہ کے ساتھ آٹھ آیات میں مذکور ہے جن کی تفصیل یہ ہے:

النساء: آیت ۵ اور ۱۲۲ المائدة: آیت ۱۱۹ التوبة: آیت ۲۲ اور ۱۰۰

التغابن: آیت ۹ البينة: آیت ۸

اور اہل دوزخ کے اوصاف میں ان تین آیات کے اندر آیا ہے:

النساء: آیت ۱۶۹ الاحزاب: آیت ۶۵ الجن: آیت ۲۳

اس لیے یہ بات تو طے ہے کہ لفظ خُلُود سے اگر کسی کو اشتباہ واقع ہوا ہے کہ اس سے مراد صرف لمبی مدت ہے تو ”اَبَدًا“ کے مذکورہ بالا اضافے سے یہ اشتباہ دور ہو جانا چاہیے۔

ہمارے استاد شیخ محمد الامین الشنقیطی نے جہنم کے ہمیشہ ہمیشہ رہنے پر قرآن کی چند آیات سے مزید استدلال کیا ہے جن سے پانچ شبہات کا بھی ازالہ ہو جاتا ہے۔

(۱) ”کفار کے عذاب میں انقطاع نہیں ہوگا۔“

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿كُلَّمَا حَبَسْتَ زِدْنَاهُمْ سَعِيرًا ۝۹۷﴾ (بنی اسرائیل)

”یہ آگ جب کبھی بجھنے لگے گی تو ہم اسے اور بھڑکا دیں گے۔“

اور یہ نحوی قاعدہ ہے کہ ”کُلَّمَا“ کے لفظ میں تکرار پایا جاتا ہے۔ جیسے سورۃ النساء میں ارشاد فرمایا:

﴿كُلَّمَا نَضَجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا﴾ (آیت ۵۶)

”جو نبی ان کی کھالیں پک جائیں گی ہم انہیں دوسری کھالوں سے بدل دیں گے۔“

(۲) ”انہیں موت نہیں آئے گی۔“

سورۃ فاطر میں ارشاد فرمایا:

﴿لَا يُقْضَىٰ عَلَيْهِمْ فَيَمُوتُوا﴾ (آیت ۳۶) ”نہ تو ان کی قضا ہی آئے گی کہ وہ مرجائیں۔“

سورۃ طہ میں ارشاد فرمایا:

﴿فَإِنَّ لَهُ جَهَنَّمَ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ ۝۷۷﴾ ”اس کے لیے دوزخ ہے جہاں نہ موت ہوگی نہ زندگی۔“

سورۃ ابراہیم میں ارشاد فرمایا:

﴿وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ۝۱۷﴾ (آیت ۱۷)

”اُسے ہر جگہ سے موت آتی دکھائی دے گی لیکن وہ مرنہ سکے گا۔“

نبی کریم ﷺ نے ایک صحیح حدیث کے مطابق ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن موت کو ایک بھورے مینڈھے

کی شکل میں لا کر ذبح کر دیا جائے گا اور پھر کہا جائے گا:

((يَا أَهْلَ الْجَنَّةِ خُلُودٌ فَلَا مَوْتَ، خُلُودٌ فَلَا مَوْتَ))

”اے اہل جنت! اب ہمیشہ رہنا ہے، اب موت نہ ہوگی، اب ہمیشہ رہنا ہے، موت نہ ہوگی۔“

(۳) ”وہ جہنم سے نکالے نہیں جائیں گے۔“

سورۃ المائدہ میں ارشاد فرمایا:

﴿يُرِيدُونَ أَنْ يُخْرِجُوا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنْهَا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ۝۴۷﴾

”وہ آگ سے نکلنا چاہیں گے لیکن وہ اس سے نکل نہ پائیں گے اور ان کے لیے دائمی عذاب ہوگا۔“

اور سورۃ السجدہ میں ارشاد فرمایا:

﴿كُلَّمَا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا أُعِيدُوا فِيهَا.....﴾ (آیت ۲۰)
 ”جب کبھی وہ اس آگ سے نکلنا چاہیں گے وہ دوبارہ اس میں لوٹا دیے جائیں گے.....“
 (۴) ”ان کے عذاب میں تخفیف بھی نہ کی جائے گی۔“

سورہ آل عمران میں ارشاد فرمایا:
 ﴿لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ﴾ (۷۸)
 ”ان کے عذاب میں تخفیف نہ کی جائے گی اور نہ ہی انہیں مہلت دی جائے گی۔“
 سورہ الزخرف میں ارشاد فرمایا:

﴿لَا يَفْتَرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيهِ مُبْلِسُونَ﴾ (۵۵)
 ”یہ عذاب کبھی بھی ان سے ہلکا نہ کیا جائے گا اور وہ مایوسی میں پڑے رہیں گے۔“
 سورہ فاطر میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِنْ عَذَابِهَا ۚ كَذَلِكَ نَجْزِي كُلَّ كَفُورٍ﴾ (۳۱)
 ”اور انہیں جو عذاب دیا جا رہا ہے اس میں تخفیف نہ کی جائے گی اور ہم اسی طرح ہر ناشکرے کو بدلہ دیتے ہیں۔“
 سورہ الفرقان میں دو جگہ ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا﴾ (۵۰) ”وہاں کا عذاب چھوٹنے والا نہیں ہے۔“
 ﴿فَسَوْفَ يَكُونُ لَؤْلَؤًا﴾ (۵۱) ”(پس) عذاب تو) انہیں چمٹا رہے گا۔“

ان تمام آیات سے بصراحت یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہ عذاب ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اس میں تخفیف تک نہ ہوگی بلکہ اگر آگ ٹھنڈی بھی پڑ جائے تو اسے اور دھکا دیا جائے گا اور آگ کے عذاب سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہوگا۔
 بعض علماء نے یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ اگرچہ ان آیات سے آگ کا فائدہ ہونا ثابت ہوتا ہے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آگ فائدہ ہوگی، کیونکہ یہ بات وعید (دھمکی) میں داخل ہے اور وعید کی خلاف ورزی ایک مستحسن امر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدے کے برخلاف جانے کی نفی کی ہے، لیکن یہ نہیں کہا کہ میں وعید کی بھی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔

لیکن ہم اس رائے کے حامی نہیں ہیں اور وہ اس لیے کہ:
 پہلی بات تو یہ ہے کہ اس سے پھر یہ لازم آئے گا کہ کافر جہنم میں داخل نہ ہو، کیونکہ جہنم میں داخل ہونا تو از قسم وعید ہے اور اس رائے کے مطابق اللہ تعالیٰ اپنی وعید کی خلاف ورزی کر سکتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو جھٹلانے والوں کے حق میں اپنی وعید کے حق ہونے (یعنی پورا ہونے) کا ذکر کیا ہے۔
 سورہ ق میں پہلے ارشاد فرمایا:

﴿كُلُّ كَذَّابٍ رُسُلٌ فَحَقَّ وَعِيدُ﴾ (۱۶)
 ”ان میں سے ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا تو میری وعید ان پر واقع ہوگئی۔“

اور پھر دوبارہ ارشاد فرمایا:

﴿قَالَ لَا تَخْتَصِمُوا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ إِلَيْكُمْ بِالْوَعِيدِ ۚ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَا أَنَا بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيدِ ۝﴾

”اللہ تعالیٰ نے کہا: میرے سامنے جھگڑا نہ کرو جبکہ میں نے تمہیں پہلے ہی وعید دے دی تھی۔ میرے قول میں تبدیلی نہیں آتی اور میں بدوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہوں۔“

سورۃ المرسلات میں ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّمَا تُوْعَدُونَ لَوَاقِعٍ ۝﴾ ”جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ واقع ہو کر رہے گی۔“

البتہ اہل ایمان میں سے جو لوگ گناہ گار ہوں گے ان کے لیے اس بات کی گنجائش ہے کہ ان کے حق میں وعید پوری نہ ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے شرک کو چھوڑ کر دوسرے گناہوں کو معاف کرنے کا وعدہ کیا ہے، ارشاد فرمایا:

﴿وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَن يَشَاءُ ۝﴾ (النساء: ۴۸ و ۱۱۶)

”اور اس (یعنی شرک) کے علاوہ وہ معاف کر دے گا جس کے لیے چاہے گا۔“

کفار کے لیے دائمی عذاب پر تعجب نہ ہونا چاہیے، وہ اس لیے کہ ان کی خباثت بھی دائمی تھی، اس لیے ان کے لیے دائمی عذاب ہی ضروری تھا۔ ان کفار کے بارے میں سورۃ الانفال میں ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الضُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ۝ وَلَوْ عَلِمَ اللَّهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَّاسْمَعَهُمْ ۖ وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَهُمْ مُعْرِضُونَ ۝﴾

”بے شک بدترین مخلوق اللہ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جو بہرے ہیں اور گونگے ہیں اور جو ذرا نہیں سمجھتے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ ان میں کوئی بھلائی دیکھتا تو ان کو سننے کی توفیق دے دیتا، اور اگر ان کو اب سنا بھی دے تب بھی وہ پلٹ کر بھاگیں گے بے رخی کرتے ہوئے۔“

اور سورۃ الانعام میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلَوْ رَدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ ۝﴾ (آیت ۲۸)

”اور اگر انہیں لوٹا بھی دیا جائے تو بھی وہ دوبارہ وہی کچھ کریں گے جس سے انہیں منع کیا گیا تھا۔“

اور یہاں ہم پر یہ واضح کرتے چلیں کہ کفار کو جو عذاب دیا جائے گا وہ انہیں ذلیل کرنے اور ان سے انتقام لینے کے لیے دیا جائے گا، انہیں پاک و صاف کرنے کے لیے نہیں، جیسا کہ ارشاد فرمایا:

﴿وَلَا يُزَكِّيهِمْ ۝﴾ (البقرة: ۱۷۴) ”اور وہ انہیں پاک نہیں کرے گا۔“

اور ارشاد فرمایا:

﴿وَلِلْكَافِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِينٌ ۝﴾ (المجادله) ”اور کافروں کے لیے ذلت والا عذاب ہے۔“

(بحوالہ کتاب: دفع اہیام الاضطراب عن آیات الكتاب تألیف شیخ محمد الامین الشنقیطی، صفحات ۱۲۳ تا ۱۲۸)



ترجمہ قرآن مجید

مع صرفی و نحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم
ترتیب و تدوین: لطف الرحمن خان

سورة الاعراف

آیات ۹۴ تا ۱۰۲

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّبِيٍّ إِلَّا أَخَذْنَا أَهْلَهَا بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَاءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُونَ ﴿٩٤﴾
ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتَّىٰ عَفَوْا وَقَالُوا قَدْ مَسَّ آبَاءَنَا الضَّرَّاءُ وَالسَّرَّاءُ
فَأَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٩٥﴾ وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم
بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٩٦﴾ أَفَأَمِّنَ أَهْلُ
الْقُرَىٰ أَن يَأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا بَيَاتًا وَهُمْ نَائِبُونَ ﴿٩٧﴾ وَأَمِّنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَن يَأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا صُحًى
وَهُمْ يُلْعَبُونَ ﴿٩٨﴾ أَفَأَمِنُوا مَكْرَ اللَّهِ ۚ فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٩٩﴾ أَوَلَمْ يَهْدِ
لِلَّذِينَ يَرِثُونَ الْأَرْضَ مِن بَعْدِ أَهْلِهَا أَن لَّوْ شَاءَ أَصْبَنَاهُمْ بِذُنُوبِهِمْ وَنُطْبَعُ عَلَىٰ
قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿١٠٠﴾ تِلْكَ الْقُرَىٰ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنبَاءِهَا ۚ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ
رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ ۖ فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِهَا كَذَّبُوا مِن قَبْلُ ۖ كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِ
الْكَافِرِينَ ﴿١٠١﴾ وَمَا وَجَدْنَا لِأَكْثَرِهِمْ مِن عَهْدٍ ۚ وَإِن وَجَدْنَا أَكْثَرَهُمْ لَفَاسِقِينَ ﴿١٠٢﴾

ض ح ی

صَحَّیْ یَضْحَیْ (س) صَحَّیْ: سورج سے تکلیف اٹھانا، دھوپ لگنا، دھوپ کھانا۔ ﴿وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ
فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ﴾ ﴿١٩﴾ ﴿ظہ﴾ ”اور یہ کہ تجھ کو نہ پیاس لگے اس میں اور نہ تجھ کو دھوپ لگے۔“
صَحَّیْ: دن چڑھے چاشت کا وقت۔ زیر مطالعہ آیت ۹۸

صَرَ عَ يَضْرَعُ (ف) صَرَاعَةً : کمزور ہونا، بے فائدہ ہونا۔

صَرِيعٌ (فَعِيلٌ) کے وزن پر صفت) : بے فائدہ، خاردار درخت۔ ﴿لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِنْ صَرِيْعٍ ۝﴾ (الغاشية) ”نہیں ہوگا ان کے لیے کوئی کھانا مگر ایک خاردار درخت میں سے۔“

تَضَرَّعَ يَتَضَرَّعُ (تَفْعَلُ) تَضَرُّعًا : کمزوری اور عاجزی کا اظہار کرنا، گڑگڑانا۔ زیر مطالعہ آیت ۹۴

ترکیب

آیت ۹۵ میں ”فَاَخَذْنَا“ کا مفعول ”هُمْ“ کی ضمیر ہے جبکہ ”بَعَثْنَا“ حال ہے۔ آیت ۹۷ میں ”يَبَيِّتًا“ اور ۹۸ میں ”ضُحًى“ ظرف ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہیں۔ آیت ۱۰۰ میں ”مِنْ بَعْدِ اَهْلِيهَا“ میں ”مِنْ بَعْدِ“ کے بعد ہلاکت کا لفظ محذوف ہے اور یہ پورا فقرہ ”لَمْ يَهْدِ“ کا فاعل ہے۔ آیت ۱۰۲ میں ”لَفْسِقِينَ“ پر لام تاکید سے معلوم ہوا کہ ”اِنْ وَجَدْنَا“ کا ”اِنْ“ نافیہ نہیں بلکہ ”اِنْ“ مخففہ ہے جس کے معنی ہیں ”بے شک“۔

ترجمہ:

وَمَا أَرْسَلْنَا : اور ہم نے نہیں بھیجا
مِّن نَّبِيٍّ : کوئی بھی نبی
أَخَذْنَا : ہم نے پکڑا
بِالْبِاسَاءِ : سختی سے
لَعَلَّهُمْ : شاید وہ لوگ
نَمَّ : پھر
مَكَانَ السَّيِّئَةِ : برائی کی جگہ کو
حَتَّى : یہاں تک کہ
وَقَالُوا : اور کہا
أَبَاءَ نَا : ہمارے باپ دادوں کو
وَالسَّرَّاءُ : اور خوشی (بھی)
بَعَثْنَا : اچانک
هُمْ : وہ لوگ
وَلَوْ : اور اگر
أَهْلَ الْقُرَى : ان بستیوں والے
وَاتَّقُوا : اور تقویٰ اختیار کرتے
عَلَيْهِمْ : ان پر

فِي قَرْيَةٍ : کسی بستی میں
إِلَّا : مگر یہ کہ
أَهْلُهَا : اس کے لوگوں کو
وَالضَّرَّاءُ : اور تکلیف سے
يَضْرَعُونَ : گڑگڑائیں
بَدَلْنَا : ہم نے بدل دیا
الْحَسَنَةَ : بھلائی سے
عَفَوْنَا : وہ لوگ بڑھے (ترقی کی)
قَدْ مَسَّ : چھو چکی ہے
الضَّرَّاءُ : تکلیف (بھی)
فَاَخَذْنَاهُمْ : تو ہم نے پکڑا ان کو
وَا : اس حال میں کہ
لَا يَشْعُرُونَ : شعور نہیں رکھتے تھے
أَنَّ : یہ کہ
أَمَنُوا : ایمان لاتے
لَفَتَحْنَا : تو ہم ضرور کھول دیتے
بَرَكَتٍ : برکتیں

مِّنَ السَّمَاءِ: آسمان سے
وَلَكِن: اور لیکن

فَاخَذْنَهُمْ: تو ہم نے پکڑ ان کو
كَانُوا يَكْسِبُونَ: وہ لوگ کمائی کرتے تھے

أَهْلُ الْقُرَى: بستیوں والے
يَأْتِيَهُمْ: پہنچے ان کو

بَيَاتًا: رات کے وقت
هُمْ: وہ لوگ

أَوْ أَمِنَ: اور کیا امن میں ہوئے
أَنْ: (اس سے) کہ

بَأْسُنَا: ہماری سختی
وَّ: اس حال میں کہ

يَلْعَبُونَ: کھیلتے ہوں
مَكْرَ اللَّهِ: اللہ کی خفیہ تدبیر سے

مَكْرَ اللَّهِ: اللہ کی تدبیر سے
الْقَوْمُ الْخَاسِرُونَ: خسارہ پانے والے لوگ

لَمْ يَهْدِ: رہنمائی نہیں کی
يَرْثُونَ: وارث ہوئے

مِنْ بَعْدِ أَهْلَيْهَا: اس کے رہنے والوں
(کی ہلاکت) کے بعد

لَوْ: اگر

أَصْبَحْنَاهُمْ: تو ہم پہنچیں ٹھیک ان کو ہی
وَنَطْبَعُ: اور ہم چھاپ لگا دیتے ہیں

فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ: تو وہ لوگ نہیں سنتے
نَقْصُ: ہم سناتے ہیں

مِنْ أَنْبَاءِهَا: جن کی خبروں میں سے
رُسُلُهُمْ: ان کے رسول

فَمَا كَانُوا: تو وہ لوگ نہیں تھے

وَالْأَرْضِ: اور زمین سے
كَذَّبُوا: انہوں نے جھٹلایا

بِمَا: بسبب اس کے جو
أَقَامِنَ: تو کیا امن میں ہوئے

أَنْ: (اس سے) کہ
بَأْسُنَا: ہماری سختی

وَّ: اس حال میں کہ
نَأْمُونُ: نیند کرنے والے ہوں

أَهْلُ الْقُرَى: بستیوں والے
يَأْتِيَهُمْ: پہنچے ان کو

ضَحًى: چاشت کے وقت
هُمْ: وہ لوگ

أَقَامِنَا: تو کیا وہ لوگ امن میں ہوئے
فَلَا يَأْمَنُ: پس امن میں نہیں ہوتے

إِلَّا: مگر
أَوْ: اور کیا

لِلَّذِينَ: ان کے لیے جو
الْأَرْضِ: زمین کے

أَنْ: کہ

نَشَاءُ: ہم چاہیں
بِذُنُوبِهِمْ: بسبب ان کے گناہوں کے

عَلَى قُلُوبِهِمْ: ان کے دلوں پر
تِلْكَ الْقُرَى: یہ بستیاں

عَلَيْكَ: آپ کو
وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ: اور آپ جگے ہیں ان کے پاس

بِالْبَيِّنَاتِ: واضح (نشانیوں) کے ساتھ
لِيُؤْمِنُوا: کہ ایمان لاتے

بِمَا: اس پر جس کو
مِنْ قَبْلُ: اس سے پہلے
يَطْبَعُ: چھاپ لگاتا ہے
عَلَى قُلُوبِ الْكَافِرِينَ: انکار کرنے والوں
کے دلوں پر

لَا كُثْرَهُمْ: ان کے اکثر کے لیے
وَإِنْ: اور بے شک
أَكْثَرُهُمْ: ان کے اکثر کو
مِنْ عَهْدٍ: وعدہ کی کوئی پابندی
وَجَدْنَا: ہم نے پایا
لَفَسِقِينَ: یقیناً نافرمانی کرنے والے

نوٹ: ایک ایک قوم کا معاملہ الگ الگ بیان کر کے جو سبق انسانیت کو دیا گیا ہے اسے اب ایک جامع ضابطہ کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اس ضابطے کی ایک اہم شق انبیاء ﷺ کی بعثت ہے۔ اور اب چونکہ نبوت و رسالت کا دروازہ بند ہو چکا ہے اس لیے ہم لوگ سمجھتے ہیں کہ آج کے دور میں اس ضابطہ کا اطلاق نہیں ہوگا اور ہمارا ان آیات سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس غلط فہمی کو دور کرنا ضروری ہے۔

انبیاء کرام ﷺ کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ گم کردہ راہ انسانوں کو ہدایت اور راہنمائی فراہم کی جائے۔ لیکن ختم نبوت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسانیت کی رہنمائی کے سلسلہ کو ختم کر دیا گیا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آخری نبی ﷺ جو ہدایات لائے تھے انہیں قیامت تک کے لیے محفوظ کر دیا گیا ہے، اس لیے اب کسی نئے نبی کو بھیجنے کی ضرورت باقی نہیں رہی اور اب قیامت تک قرآن و حدیث سے بعثت انبیاء کا مقصد پورا ہوتا رہے گا۔ اس لیے مذکورہ ضابطہ کا اطلاق آج بھی اسی طرح ہوگا جیسے ماضی میں ہوا ہے اور قیامت تک اسی طرح ہوتا رہے گا۔

ضابطہ یہ ہے کہ اقوام کو اچھے اور برے حالات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی فراہم کردہ رہنمائی کی طرف راغب کیا جاتا ہے۔ لیکن جب کسی قوم کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ نہ تو مصائب سے ان کا دل اللہ کے آگے جھکتا ہے نہ ہی نعمتوں پر وہ شکر گزار ہوتی ہے اور کسی حال میں بھی اصلاح قبول نہیں کرتی تو بربادی اس کا مقدر ہو جاتی ہے۔ اپنے ہاتھوں کی لکھی ہوئی اس تقدیر کو ان کی قوت و اقتدار، دولت و ثروت اور ٹیکنالوجی تبدیل نہیں کر سکتی۔ گزشتہ آیات میں جن اقوام کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب اپنے اپنے وقت میں عروج و ترقی کی اس حد کو پہنچ چکی تھیں کہ دنیا میں ان کا کوئی مد مقابل نہیں رہا تھا، لیکن جب ان کے ہاتھوں کی کمائی ان کے سامنے آئی تو ان کی سائنس و ٹیکنالوجی ان کو نہ بچا سکی۔

آج کے دور میں مغربی تہذیب بھی اپنے عروج کی اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ اب دنیا میں ان کا کوئی مقابل باقی نہیں رہا۔ ان لوگوں نے آثارِ قدیمہ پر بھی بہت تحقیقات کی ہیں۔ اقوام کے عروج و زوال پر بڑی سائنٹیفک ریسرچ ہوئی ہیں۔ لیکن اس ساری افلاطونیت اور ارسطونیت میں کہیں بھی نہ تو مسبب الاسباب ہستی کا ذکر ہے اور نہ ہی اس کے ضابطوں کا۔ ایسی صورت میں اصلاح کا امکان ختم ہو گیا ہے اور اس تہذیب کی تباہی اس کا مقدر ہو گئی ہے۔

آیات ۱۰۳ تا ۱۱۳

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِم مُّوسَىٰ بِآيَاتِنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَظَلَمُوا بِهَا ۚ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ۝ وَقَالَ مُوسَىٰ يُفْرِعُونَ إِيَّيْ رَسُولٍ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ حَقِيقٌ عَلَىٰ أَنْ لَا أَقُولَ عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقُّ ۚ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ فَأَرْسِلْ مَعِيَ بَنِي إِسْرَءِيلَ ۚ قَالَ إِنْ كُنْتَ جَاءت بِآيَةٍ فَأْتِ بِهَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِينَ ۝ فَالْقَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِينٌ ۚ وَنَزَعْنَا يَدَهُ فَإِذَا هِيَ بَيْضَاءُ لِلنّٰظِرِينَ ۚ قَالَ الْهَلَا مِنْ قَوْمٍ فِرْعَوْنَ إِنَّ هَذَا لَسَاحِرٌ عَلِيمٌ ۚ يُرِيدُ أَنْ يُخْرِجَكُمْ مِنْ أَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَأْمُرُونَ ۚ قَالُوا أَرْجِهْ وَأَخَاهُ وَأَرْسِلْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِينَ ۚ يَأْتُوكَ بِكُلِّ سَاحِرٍ عَلِيمٍ ۝ وَجَاءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوا إِنَّ لَنَا لَأَجْرًا إِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغَالِبِينَ ۚ قَالَ نَعَمْ وَإِنَّكُمْ لَوِنَ الْمُبْقَرِينَ ۝

ث ع ب

ثُعْبَانٌ مُّبِينٌ (ف) ثُعْبَانٌ: پانی کو جاری کرنا پانی بہانا۔

ثُعْبَانٌ (فُعْلَانٌ کے وزن پر مبالغہ): اڑدھا۔ (کیونکہ یہ زمین پر ایسے چلتا ہے جیسے پانی بہتا ہے۔) یہ مذکر

اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ زیر مطالعہ آیت ۱۰۷

ترکیب

(آیت ۱۰۳) ”بِهَا“ کی ضمیر ”آيَاتِنَا“ کے لیے ہے۔ (آیت ۱۰۵) ”حَقِيقٌ عَلَى“ گزشتہ آیت میں ”إِنِّي“ پر عطف ہے۔ (آیت ۱۰۷) ”هِيَ“ کی ضمیر ”عَصَا“ کے لیے ہے جو مؤنث سماعی ہے۔ (آیت ۱۱۱) ”أَرْجِهْ“ میں ہائے سکت نہیں ہے، کیونکہ اس صورت میں ”وَأَخَاهُ“ کا فقرہ بے معنی ہو جاتا ہے۔ یہ دراصل فعل امر ”أَرْجِ“ کی ضمیر مفعولی ہے۔ یہ قرآن مجید کی مخصوص قراءت اور املا ہے کہ اس کو ”أَرْجِهْ“ کے بجائے ”أَرْجِهْ“ پڑھتے اور لکھتے ہیں۔ (آیت ۱۱۲) ”يَأْتُوكَ“ میں ”يَأْتُوْا“ مضارع مجزوم ہے، فعل امر ”أَرْسِلْ“ کا جواب امر ہونے کی وجہ سے۔ (آیت ۱۱۳) ”إِنْ لَنَا لَأَجْرًا“ جواب شرط مقدم ہے اور ”إِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغَالِبِينَ“ شرط ہے۔ اس لیے ان کا ترجمہ مستقبل میں ہوگا۔

ترجمہ:

ثُمَّ بَعَثْنَا: پھر ہم نے بھیجا

مُوسَىٰ: موسیٰ کو

إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ: فرعون اور اس کے

سرداروں کی طرف

بِهَا: ان (نشیوں) پر

فَطَلَمُوا: تو انہوں نے ظلم کیا

فَانْظُرْ: تو غور کرو

كَيْفَ: کیسا

كَانَ: تھا

عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ: نظم بگاڑنے والوں کا انجام

وَقَالَ: اور کہا

مُوسَى: موسیٰ نے

يَلْفِرُ عَوْنُ: اے فرعون

إِنِّي: کہ میں

رَسُولٌ: ایک رسول ہوں

مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ: تمام جہانوں کے رب

(کی طرف) سے

حَقِيقٌ عَلَى: (مجھ پر) لازم ہے

أَنْ: کہ

لَا أَقُولُ: میں نہ کہوں

عَلَى اللَّهِ: اللہ پر

إِلَّا: مگر

الْحَقُّ: حق

قَدْ جِئْتُكُمْ: میں لایا ہوں تمہارے پاس

بَيِّنَةٍ: واضح (نشانی)

مِنْ رَبِّكُمْ: تمہارے رب (کی طرف) سے

فَارْسِلْ: پس تو بھیج

مَعِيَ: میرے ساتھ

بَنِي إِسْرَآءِیلَ: بنی اسرائیل کو

قَالَ: اس نے کہا

إِنْ: اگر

كُنْتُ جِئْتُ: تو لایا ہے

بِآيَةٍ: کوئی نشانی

فَأْتِ: تو لے آ

بِهَا: اسے

إِنْ: اگر

كُنْتُ: تو ہے

مِنَ الصَّادِقِينَ: سچ کہنے والوں میں سے

فَأَلْفَى: تو انہوں نے ڈالا

عَصَاهُ: اپنا عصا

فَإِذَا: تو جب ہی

هِيَ: وہ

ثُعْبَانٌ مُّبِينٌ: ایک واضح (جیتا جاگتا) اژدھا تھا

وَنَزَعَ: اور انہوں نے کھینچ نکالا

يَدَهُ: اپنا ہاتھ

فَإِذَا: تو جب ہی

هِيَ: وہ

بَيَضَاءُ: سفید تھا

لِلنَّاطِرِينَ: دیکھنے والوں کے لیے

قَالَ: کہا

الْمَلَأُ: سرداروں نے

مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ: فرعون کی قوم میں سے

إِنَّ: بے شک

هَذَا: یہ

كَسِحْرِ عَالِمٍ: یقیناً ایک علم والا جادوگر ہے

يُرِيدُ: وہ ارادہ رکھتا ہے

أَنْ: کہ

يُخْرِجَكُمْ: وہ تم لوگوں کو نکالے

مِنْ أَرْضِكُمْ: تمہاری زمین سے

فَمَاذَا: (فرعون نے پوچھا) پھر کیا

تَأْمُرُونَ: تم لوگ مشورہ دیتے ہو

قَالُوا: انہوں نے کہا
وَآخَاهُ: اور اس کے بھائی کو
فِي الْمَدَائِنِ: شہروں میں
يَأْتُونَكَ: وہ لوگ لے آئیں گے تیرے پاس
وَجَاءَ: اور آئے
فِرْعَوْنَ: فرعون کے پاس
إِنَّ: بے شک
لَا جُرْأً: یقیناً کچھ اجرت ہوگی
كُنَّا: ہم ہوئے
الْغُلَبَيْنِ: غلبہ پانے والے ہوں
نَعَمْ: ہاں
لَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ: یقیناً قریب کیے ہوؤں
میں سے ہو گے

أَرْجِهْ: تو ٹال دے اس کو
وَأَرْسِلْ: اور تو بھیج
حَشِرِينَ: جمع کرنے والوں کو
بِكُلِّ سَلْحٍ عَلِيمٍ: ہر ایک جاننے والے
جادوگر کو
السَّحَرَةُ: جادوگر لوگ
قَالُوا: انہوں نے کہا
لَنَا: ہمارے لیے
إِنْ: اگر
نَحْنُ: کہ ہم ہی
قَالَ: اس نے کہا
وَأَنكُمْ: اور بے شک تم لوگ

نوٹ ۱: یہ بات نوٹ کر لیں کہ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں دو فرعونوں کا ذکر آتا ہے۔ ایک وہ جس کے زمانے میں آپ پیدا ہوئے اور اسی کے گھر میں پرورش پائی۔ اس کا نام دعمسیس تھا۔ دوسرا اس کا بیٹا مفتاح ہے۔ یہ اس وقت حکمران تھا جب موسیٰ علیہ السلام کی دعوت لے کر مصر پہنچے تھے اور یہی غرق ہوا تھا۔

نوٹ ۲: چند قوموں اور ان کے پیغمبروں کا حوالہ دینے کے بعد اب موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ قدرے تفصیل سے بیان کیا جا رہا ہے۔ اس میں متعدد مضامین اور اسباق ہیں۔ لیکن اس سارے قصے میں جو سب سے اہم سبق ہے وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے بھی تھا اور قیامت تک ہر اس اہل حق گروہ کے لیے رہے گا جو باطل سے نیچے آزمائی کی ”جرات“ کرتا ہے۔

اس قصے کے پیرائے میں یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ دعوت حق کے ابتدائی مرحلوں میں حق اور باطل کی قوتوں کا جو تناسب بظاہر نظر آتا ہے، اس سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ حق کی تو پوری تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ وہ ایک معمولی اقلیت سے شروع ہوتا ہے اور بغیر کسی ساز و سامان کے اس باطل کے خلاف لڑائی چھیڑ دیتا ہے جس کی پشت پر بڑی بڑی قوموں اور سلطنتوں کی طاقت ہوتی ہے۔ پھر بھی آخر کار حق ہی غالب آ کر رہتا ہے۔ اس قصے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ حق کے مقابلہ میں جو چالیں چلی جاتی ہیں وہ کس طرح الٹی پڑتی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ باطل کی ہلاکت کا آخری فیصلہ کرنے سے پہلے اس کو کتنی کتنی طویل مدت تک سنبھلنے اور درست ہونے کے مواقع دیتا چلا جاتا ہے۔ اور جب وہ کسی بات کا اثر قبول نہیں کرتا تو پھر اسے ہلاک کر دیا جاتا ہے اور نشانِ عبرت بنادیا جاتا ہے۔ (تفہیم القرآن)

آیات ۱۱۵ تا ۱۲۶

قَالُوا يَمُوسَىٰ إِمَّا أَنْ تُلْقَىٰ وَإِمَّا أَنْ نَكُونَ نَحْنُ الْمُلْقِينَ ۖ قَالَ أَلْقُوا فَلَمَّا أَلْقَوْا سَحَرُوا
أَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوهُمْ وَجَاءُوا بِسِحْرِ عَظِيمٍ ۖ وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنْ أَلْقِ
عَصَاكَ فَإِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُونَ ۖ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۖ فَغُلِبُوا
هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوا صَغِيرِينَ ۖ وَأَلْقَى السَّحَرَةُ سِحْرَ سَاجِدِينَ ۖ قَالُوا أَمَّا بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۖ رَبِّ
مُوسَىٰ وَهَارُونَ ۖ قَالَ فِرْعَوْنُ اأَمْنْتُمْ بِهِ قَبْلَ أَنْ أَدْنَىٰ لَكُمْ ۖ إِنَّ هَذَا الْمَكْرُ مَكْرُتُهُ فِي
الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجُوا مِنْهَا أَهْلَهَا ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ۖ لَأَقْطَعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ مِنْ
خِلَافٍ ثُمَّ لَأَصْلَبَنَّكُمْ أَجْمَعِينَ ۖ قَالُوا إِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا مُنْقَلِبُونَ ۖ وَمَا نَنْفَعُ مَنَا إِلَّا أَنْ أَمَّا
بِأَيْتِ رَبِّنَا لَمَّا جَاءَتْنَا ۖ رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَتَوَقَّنا مُسْلِمِينَ ۝

ل ق ف

لَقِفْ يَلْقَفُ (س) لُقِفَا: کسی چیز کو جلدی جلدی لینا، ٹکنا۔ زیر مطالعہ آیت ۱۱۷

ترکیب

(آیت ۱۱۵) اس آیت میں جو ”امّا“ ہے یہ ”ان“ اور ”مّا“ کا مرکب نہیں ہے۔ (ملاحظہ ہوا البقرة: ۳۸) ترکیب) بلکہ یہ ایک لفظ ہے۔ یہ بھی شرطیہ ہے اور دو فعلوں پر آتا ہے۔ اس کا ترجمہ عام طور پر ”یا تو..... اور یا پھر“ کیا جاتا ہے۔ ”نَكُونُ نَحْنُ الْمُلْقِينَ“ میں ”نَحْنُ“ ضمیر فاعل ہے اور ”نَكُونُ“ کی خبر ہونے کی وجہ سے ”الْمُلْقِينَ“ حالتِ نصب میں آیا ہے۔

ترجمہ:

قَالُوا: (جادوگر) بولے	يَمُوسَى: اے موسیٰ
إِمَّا: یا تو	أَنْ: یہ کہ
تُلْقَى: آپ ڈالیں	وَأَمَّا: اور یا پھر
أَنْ: یہ کہ	نَكُونُ: ہم ہوں
نَحْنُ: کہ ہم ہی	الْمُلْقِينَ: ڈالنے والے ہوں
قَالَ: انہوں نے کہا	أَلْقُوا: تم لوگ ڈالو
فَلَمَّا: پھر جب	أَلْقُوا: انہوں نے پھینکا
سَحَرُوا: تو انہوں نے جادو کیا	أَعْيُنَ النَّاسِ: لوگوں کی آنکھوں پر
وَاسْتَرْهَبُوهُمْ: اور ان کو خوفزدہ کیا	وَجَاءُوا: اور وہ لائے
بِسِحْرِ عَظِيمٍ: ایک عظیم جادو	وَأَوْحَيْنَا: اور ہم نے وحی کیا

إِلَى مُوسَى: موسىٰ کی طرف
الْقِي: آپ ڈالیں

فَإِذَا: پھر جب ہی
تَلَفُّفٌ: نکلنے لگا

يَا فُكُؤُنْ: وہ جھوٹی بناوٹ کر رہے تھے
الْحَقُّ: حق

مَا: وہ جو

فَغُلِبُوا: پس وہ مغلوب ہوئے

وَأَنْقَلَبُوا: اور وہ پلٹے

وَالْقِي: اور ڈالے گئے

سَلْجِدِينَ: سجدہ کرنے والوں کی حالت میں

أَمَنَّا: ہم ایمان لائے

رَبِّ مُوسَى وَهَارُونَ: جو ہارون اور موسیٰ

کا رب ہے

فِرْعَوْنُ: فرعون نے

بِهِ: اس پر

أَذِنَ: میں اجازت دیتا

إِنَّ: بے شک

لَمَكْرُ: یقیناً ایک چال ہے

فِي الْمَدِينَةِ: اس شہر میں

مِنْهَا: اس (شہر) سے

فَسَوْفَ: تو عنقریب

لَأَقْطَعَنَّ: میں لازماً کاٹوں گا

وَأَرْجُلُكُمْ: اور تمہارے پیروں کو

ثُمَّ: پھر

أَجْمَعِينَ: سب کے سب کو

إِنَّا: بے شک ہم

مُنْقَلِبُونَ: لوٹنے والے ہیں

أَنْ: کہ

عَصَاكَ: اپنا عصا

هِيَ: وہ

مَا: اس کو جو

فَوَقَعَ: پس واقع ہوا

وَبَطَلَ: اور باطل ہوا

كَانُوا يَعْمَلُونَ: وہ لوگ کیا کرتے تھے

هَٰذَاكَ: وہیں

صَلْعَيْنِ: حقیر ہوتے ہوئے

السَّحَرَةُ: جادوگر لوگ

قَالُوا: انہوں نے کہا

يَرْبِّ الْعَالَمِينَ: تمام جہانوں کے رب پر

قَالَ: کہا

أَمْنُكُمْ: تم لوگ ایمان لے آئے

قَبْلَ أَنْ: اس سے پہلے کہ

لَكُمْ: تم لوگوں کو

هَٰذَا: یہ

مَكْرُمُوهُ: تم لوگوں نے تدبیر کی جس کی

لِنُخْرِجُوا: تاکہ تم لوگ نکالو

أَهْلَهَا: اس کے لوگوں کو

تَعْلَمُونَ: تم لوگ جان لو گے

أَيَّدِيكُمْ: تمہارے ہاتھوں کو

مِنْ خِلَافٍ: مخالف (طرف) سے

لَا صَلْبَيْنَكُمْ: میں لازماً سولی چڑھاؤں گا تم کو

قَالُوا: انہوں نے کہا

إِلَى رَبِّنَا: اپنے رب کی طرف ہی

وَمَا تَنْقِمُ: اور تو انتقام نہیں لیتا

مِنَّا : ہم سے
 اَمَنَّا : ہم ایمان لائے
 لَمَّا : جب
 رَبَّنَا : اے ہمارے رب
 عَلَيْنَا : ہم پر
 وَتَوَفَّيْنَا : اور تو موت دے ہم کو

اَلَا اَنْ : سوائے اس کے کہ
 بِاٰیٰتِ رَبَّنَا : اپنے رب کی نشانیوں پر
 جَاۤءَنَا : وہ آئیں ہمارے پاس
 اَفْرُغْ : تو اٹھیل دے
 صَبْرًا : ثابت قدمی
 مُسْلِمِينَ : اس حال میں کہ ہم فرمانبردار ہوں

نوٹ: آیت ۱۲۰ میں اَلْقٰی ماضی مجہول کا صیغہ آیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ جادو گروں کو سجدے میں گرایا گیا تھا۔ اس سے ذہن میں کچھ الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ البتہ اس واقعہ کے پس منظر کی چند باتیں اگر ذہن میں واضح ہوں تو پھر یہ الجھنیں دور ہو جاتی ہیں، اس لیے پس منظر کو سمجھ لیں:

(۱) اس زمانے میں مصر، عرب اور خود بنی اسرائیل میں بھی سجدہ، تعظیمی کا رواج عام تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی ان کے سامنے سجدہ، تعظیمی ہی میں گرے تھے۔ اس لیے جادو گروں کے لیے سجدہ میں گرنا کوئی نامانوس بات نہیں تھی۔

(۲) اس وقت مصر کے لوگ سورج پرست تھے اور سورج ان کا مہاد یو یعنی ربِ اعلیٰ تھا۔ اسی معاشرے میں ایک محکوم قوم کی حیثیت سے بنی اسرائیل بھی تھے جو توحید پرست تھے۔ یہ نظریاتی تصادم ہی ان کی محکومیت کا سبب تھا۔ اگر وہ سورج پرستی اختیار کر کے فرعون کو سورج مہادیو کا اوتار تسلیم کر لیتے تو ان کی محکومیت ختم ہو جاتی۔ جیسے کہ قارون، فرعون کی حکومت کا ایک اہم رکن بن گیا تھا، حالانکہ وہ بنی اسرائیل میں سے تھا (القصص: ۷۶)۔

(۳) اس زمانے میں جادوگری ایک بہت معزز پیشہ تھا اور عام طور پر جادوگر لوگ اپنے فن کے ساتھ ساتھ دیگر علوم سے بھی بخوبی واقف ہوتے تھے۔ جیسے مسلمانوں کے عروج کے زمانے میں طبیب یعنی حکیم ہونا ایک بہت معزز پیشہ تھا اور عام طور پر حکیم لوگ حکمت کے ساتھ ساتھ اسلامی فقہ، شعر و ادب، فلکیات وغیرہ جیسے علوم سے بھی پوری واقفیت رکھتے تھے۔ اسی طرح جادوگر لوگ توحید اور سورج پرستی کے نظریاتی تصادم کے علمی مضمرات سے بخوبی واقف تھے۔

(۴) جادوگری کے علم اور فن پر عبور حاصل ہونے کی وجہ سے ان میں ہی یہ صلاحیت سب سے زیادہ تھی کہ وہ جادو اور معجزے میں تمیز کر سکیں۔

یہ وہ عوامل ہیں جن کی بنیاد پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کو اڑدھابنتے دیکھ کر ان پر حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ حضرت موسیٰ جادوگر نہیں ہیں بلکہ واقعی اللہ کے رسول ہیں۔ ان کا یہ احساس اتنا شدید تھا کہ وہ بے ساختہ سجدے میں گر پڑے، ان کے احساس کی شدت اور بے ساختگی کی کیفیت کو اجاگر کرنے کے لیے یہاں فعل مجہول اَلْقٰی استعمال ہوا ہے۔

آیات ۱۷ تا ۱۳۲

وَقَالَ الْهَلَّاكَ مِنْ قَوْمٍ فِرْعَوْنَ أَتَذَرُ مُوسَى وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ
وَالْهَتَكَ ۖ قَالَ سَقِيتُ آبْنَاءَهُمْ وَنَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ ۖ وَإِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهُونَ ۖ قَالَ مُوسَى
لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ وَاصْبِرُوا ۚ إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۖ وَالْعَاقِبَةُ
لِلْمُتَّقِينَ ۖ قَالُوا أَوُذِينَ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَأْتِيَنَا وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۚ قَالَ عَلَىٰ رَبِّكُمْ أَنْ
يُهِلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ۖ وَلَقَدْ أَخَذْنَا آلَ فِرْعَوْنَ
بِالنِّسِينِ وَنَقِصٍ مِنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَذْكُرُونَ ۖ فَإِذَا جَاءَتْهُمْ الْحَسَنَةُ قَالُوا لَنَا هَذِهِ ۖ
وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَتَّخِذُوا بِمُوسَى وَمَنْ مَعَهُ ۖ أَلَا إِنَّمَا طَرُدْتُمُوهُمُ عَنِ اللَّهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ
لَا يَعْلَمُونَ ۖ وَقَالُوا مَهْمَا تَأْتِيَانِيهِ مِنْ آيَةٍ لِنَسْكَرَنَّ بِهَا ۖ فَتَمَحَّنْ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ ۖ

ترکیب

(آیت ۱۲۹) ”مِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا“ میں ”مَا“ ظرفیہ ہے۔ ”أَنْ يَهْلِكَ“ کے ”أَنْ“ پر عطف ہونے کی وجہ سے ”يَسْتَخْلِفُ“ حالتِ نصب میں ہے جبکہ ”يَنْظُرُ“ کی نصب فاسیہ کی وجہ سے ہے۔ (آیت ۱۳۰) ”الْبَسِينِ“ (مادہ ”س ن و“) کی لغت البقرہ: ۹۶ میں دی ہوئی ہے۔ ”نَسْنَةً“ (ایک سال) کی جمع ”نَسُونُ“ عربی محاورے میں قسط سالی کے لیے بھی آتی ہے۔ جیسے انگریزی میں force کا مطلب ہے قوت، طاقت؛ جبکہ اس کی جمع forces سے فوجیں مراد ہوتی ہیں۔ (آیت ۱۳۲) ”مَهْمَا“ ان جوازم مضارع میں سے ہے جو شرط اور جواب شرط میں آنے والے دونوں مضارع افعال کو جزم دیتا ہے۔ (آسان عربی گرامر حصہ دوم، پیرا گراف ۲: ۴۳)۔ یہاں ”تَأْتِيَانِي“ میں ”تَأْتِ“ مجزوم ہے جبکہ جواب شرط میں مضارع کی جگہ جملہ اسمیہ ”مَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ“ آیا ہے اور محلاً مجزوم ہے۔

ترجمہ:

وَقَالَ الْهَلَّاكَ اور کہا
مِنْ قَوْمٍ فِرْعَوْنَ: فرعون کی قوم میں سے
أَتَذَرُ: تو نے چھوڑ رکھا ہے
وَقَوْمَهُ: اور اس کی قوم کو
فِي الْأَرْضِ: زمین میں
وَالْهَتَكَ: اور تیرے معبودوں کو
سَقِيتُ: ہم قتل کرتے رہیں گے
وَنَسْتَحْيِي: اور زندہ رکھیں گے

الْمَلَأُ: سرداروں نے
أَ: کیا
مُوسَى: موسیٰ کو
لِيُفْسِدُوا: کہ وہ لوگ نظم بگاڑیں
وَيَذَرَكَ: اور (تا کہ) وہ چھوڑ دے تجھ کو
قَالَ: اس نے کہا
أَبْنَاءَهُمْ: ان کے بیٹوں کو
نِسَاءَهُمْ: ان کی عورتوں کو

وَأَنَا: اور یقیناً ہم
فُهِرُونَ: پوری طرح قابو یافتہ ہیں
مُوسَى: موسیٰ نے
اسْتَعِينُوا: مدد مانگو
وَأَصْبِرُوا: اور ثابت قدم رہو
الْأَرْضُ: زمین
يُورِثُهَا: وہ وارث بناتا ہے اس کا
يَشَاءُ: وہ چاہتا ہے
وَالْعَاقِبَةُ: اور (بھلا) انجام
قَالُوا: انہوں نے کہا
مِنْ قَبْلِ: اس سے پہلے
تَأْتِينَا: آپ آئے ہمارے پاس
مَا: جب
قَالَ: انہوں نے کہا
رَبُّكُمْ: تمہارے رب (سے)
يُهْلِكُ: وہ ہلاک کرے
وَيَسْتَخْلِفُكُمْ: اور جانشین بنائے تم کو
فَيَنْظُرُ: تو پھر وہ دیکھے
تَعْمَلُونَ: تم لوگ عمل کرتے ہو
الْفِرْعَوْنَ: فرعون کے پیروکاروں کو
وَنَقِصْ: اور کچھ نقصان سے
لَعَلَّهُمْ: شاید وہ لوگ
فَإِذَا: پھر جب بھی
الْحَسَنَةُ: بھلائی
لَنَا: ہمارے لیے ہے
وَأَنْ: اور اگر
سَيِّئَةٌ: کوئی برائی
بِمُوسَى: موسیٰ کو

فَوَقَّهُمْ: ان کے اوپر
قَالَ: کہا
لِقَوْمِهِ: اپنی قوم سے
بِاللَّهِ: اللہ سے
إِنْ: یقیناً
لِلَّهِ: اللہ کی ہے
مَنْ: اس کو جس کو
مِنْ عِبَادِهِ: اس کے بندوں میں سے
لِلْمُتَّقِينَ: تقویٰ کرنے والوں کے لیے ہے
أَوْذَيْنَا: اذیت دی گئی ہم کو
أَنْ: کہ
وَمِنْ: بَعْدُ: اور اس کے بعد
جِئْنَا: آپ آئے ہمارے پاس
عَسَى: امید ہے
أَنْ: کہ
عَدُوَّكُمْ: تمہارے دشمن کو
فِي الْأَرْضِ: زمین میں
كَيْفَ: کیسے
وَلَقَدْ أَخَذْنَا: اور ہم پکڑ چکے ہیں
بِالسَّيِّئِينَ: قُطُوب سے
مِنَ الثَّمَرَاتِ: پھلوں میں سے
يَذْكُرُونَ: نصیحت حاصل کریں
جَاءَ تَهُمُّ: آتی ہے ان کے پاس
قَالُوا: تو وہ لوگ کہتے ہیں
هَذِهِ: یہ
تُصِيبُهُمْ: آن لگتی ہے ان کو
يَطَّيَّرُوا: تو وہ لوگ منحوس گردانتے ہیں
وَمَنْ: اور ان کو جو

مَعَهُ : ان کے ساتھ ہیں
 اِنَّمَا : کچھ نہیں سوائے اس کے کہ
 عِنْدَ اللّٰهِ : اللہ کے پاس (سے) ہے
 اَكْثَرُهُمْ : ان کے اکثر
 وَقَالُوا : اور انہوں نے کہا
 تَأْتِنَا بِهِ : تو لائے گا ہمارے پاس
 لِنَسْحَرَنَا : تاکہ تو جادو کرے ہم پر
 فَمَا نَحْنُ : تو ہم نہیں ہیں
 اَلَا : سن لو
 طَرَهُمْ : ان کی نحوست
 وَلٰكِنَّ : اور لیکن
 لَا يَعْلَمُونَ : جانتے نہیں ہیں
 مَهْمَا : جو کچھ
 مِنْ اٰيَةٍ : کوئی بھی نشانی
 بِهَا : اس سے
 لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ : تیری بات ماننے والے

آیات ۱۳۳ تا ۱۳۷

فَارْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالْدَّمَ اٰيَاتٍ مُّفَصَّلَاتٍ ۚ
 فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝ وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوا لَیْسَ بِہَا
 عٰہِدٌ عِنْدَكَ ؕ لَیْنُ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَ بِكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنٰی اِسْرَآءِیْلَ ؕ فَلَمَّا
 كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰی اَجَلٍ هُمْ بِلُغُوْةٍ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ۝ فَاتَّقِنَا مِنْهُمُ فَاعْرِضْهُمْ فِی
 الْیَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِآٰیٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ۝ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ كَانُوْا یُسْتَعْصَمُوْنَ
 مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِیْ بَرَكْنَا فِیْهَا ۚ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیِّ
 اِسْرَآءِیْلَ ؕ بِہَا صَبَرُوْا ۚ وَدَمَرْنَا مَا كَانِ یَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوْا یَعْرِشُوْنَ ۝

ج رد

جَرَدَ یَجْرُدُ (ن) جَرَدًا : کھال پر سے بال اتارنا، ننگا کرنا۔
 جَرَادٌ (اسم جنس) : ٹڈی (واحد جَرَادَةٌ) ٹڈی زمین کا سبزہ چاٹ کر اس کو ننگا کر دیتی ہے۔ زیر مطالعہ

آیت ۱۳۳۔

ق م ل

ثلاثی مجرد سے فعل نہیں آتا۔
 قُمَّلٌ (اسم جنس واحد قُمَّلَةٌ) : سر کے بالوں میں پڑنے والی جوں، گندگی پر بھنبھنانے والی باریک کھیاں،
 بھنگے۔ زیر مطالعہ آیت ۱۳۳۔

ن ك ث

نَكَثَ یَنْكُثُ (ن) نَكَثًا : کھیل کو ادھیڑنا، سوت کو ریشہ ریشہ کرنا، عہد شکنی کرنا۔ زیر مطالعہ آیت ۱۳۵۔
 نَكْثٌ ج اَنْكَاثٌ : ادھیڑا ہوا کھیل یا سوت۔ ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْ نَقَضَتْ غَزْلَہَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ﴾

أَنكَأَتْ ﴿النحل: ۹۲﴾ ”اور تم لوگ مت ہو اس عورت کی مانند جس نے توڑا اپنا کاتا ہوا سوت محنت کے بعد ادھیڑا ہوا۔“

د م ر

دَمَرٌ يَدْمُرُ (ن) دَمُورًا : ہلاک ہونا۔

دَمَرٌ يَدْمُرُ (تفعیل) تَدْمِيرًا : (۱) ہلاک کرنا۔ اس کا مفہول بنفسہ آتا ہے۔ زیر مطالعہ آیت ۱۳۷۔
(۲) کسی پر ہلاکت ڈالنا۔ اس میں علی کا صلا آتا ہے۔ ﴿دَمَرَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَلِلْكَافِرِينَ أَمْثَالُهَا﴾ (محمد)
”ہلاکت ڈالی اللہ نے ان پر اور کافروں کے لیے اس کی جیسی ہیں۔“

ترکیب

(آیت ۱۳۷) ”أَوْرَثْنَا“ کا مفعول اول ”الْقَوْمَ“ ہے۔ ”مَشَارِقَ“ اور ”مَغَارِبَ“ اس کے مفعول ثانی ہیں۔ ”الْأَرْضِ“ پر لام تعریف ہے اور ”الَّتِي“ کا تعلق بھی ”الْأَرْضِ“ سے ہے۔ ”كَلِمَتُ“ مضاف ہے اس لیے اس کی صفت ”الْحُسْنَى“ مضاف الیہ ”رَبِّكَ“ کے بعد آئی ہے۔

ترجمہ:

فَأَرْسَلْنَا: پھر ہم نے بھیجا	عَلَيْهِمْ: ان پر
الطُّوفَانَ: سائیکلون	وَالْجَرَادَ: اور ٹڈی دل
وَالْقُمَّلَ: اور بھگتے	وَالضَّفَادِعَ: اور مینڈک
وَالدَّمَ: اور خون	آيَاتٍ مُّفَصَّلَاتٍ: کھلی کھلی نشانیاں ہوتے ہوئے
فَاسْتَكْبَرُوا: نتیجے میں انہوں نے گھمنڈ کیا	وَكَانُوا: اور وہ تھے (ہی)
قَوْمًا مُّجْرِمِينَ: جرم کرنے والے لوگ	وَلَمَّا: اور جب
وَقَعَ: واقع ہوتا	عَلَيْهِمْ: ان پر
الرَّجْزُ: عذاب	قَالُوا: تو وہ کہتے
يُمُوسَى: اے موسیٰ	ادْعُ: آپ پکاریے
لَنَا: ہمارے لیے	رَبِّكَ: اپنے رب کو
بِمَا: اس کے ساتھ جس کا	عَهْدَ: اس نے وعدہ لیا
عِنْدَكَ: آپ سے	لَيْنُ: یقیناً اگر
كَشَفْتُ: آپ نے ہٹا دیا	عَنَّا: ہم سے
الرَّجْزُ: اس عذاب کو	لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ: تو ہم لازماً مان لیں گے آپ
	(کی بات) کو
	مَعَكَ: آپ کے ساتھ
وَلَنُرْسِلَنَّ: اور ہم لازماً بھیج دیں گے	

بَنِي إِسْرَآءِ يٰلَ : بنی اسرائیل کو

كَشَفْنَا : ہم نے ہٹا دیا

الرَّجْزَ : اس عذاب کو

هُمُ : (کہ) وہ

اِذَا : جب ہی

يَنْكُثُونَ : عہد شکنی کرتے

مِنْهُمْ : ان سے

فِي الْيَمِّ : پانی میں

كَذَّبُوا : جھٹلایا

وَكَانُوا : اور وہ تھے

غَافِلِينَ : غفلت برتنے والے

الْقَوْمَ الَّذِينَ : اس قوم کو جن کو

مَشَارِقَ الْأَرْضِ : اس زمین کے مشرقوں کا

النَّيِّ : وہ (زمین)

فِيهَا : جس میں

كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰی : آپ کے رب

کا اچھا وعدہ

بِمَا : بسبب اس کے جو

وَكَذَّبُوا : اور ہم نے تباہ کیا

كَانَ يَصْنَعُ : کارگیری کرتا تھا

وَقَوْمُهُ : اور اس کی قوم

كَانُوا يَعْرِشُونَ : وہ لوگ چڑھایا کرتے

تھے (یعنی پروپیگنڈا کرتے تھے)

فَلَمَّا : پھر جب

عَنْهُمْ : ان سے

إِلَىٰ أَجَلٍ : ایک مدت تک

بَلَّغُوهُ : پہنچنے والے تھے اس کو

هُمْ : وہ لوگ

فَانْتَقَمْنَا : پس ہم نے انتقام لیا

فَاَعْرِفْنَهُمْ : تو ہم نے غرق کیا ان کو

بِأَنَّهُمْ : کیونکہ انہوں نے

بِالْيَمِّ : ہماری نشانیوں کو

عَنْهَا : ان سے

وَأَوْرَثْنَا : اور ہم نے وارث بنایا

كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ : کمزور سمجھا جاتا تھا

وَمَعَارِبَهَا : اور اس کے مغربوں کا

بِرُكْنَا : ہم نے برکت دی

وَكَمَّتْ : اور تمام ہوا

عَلَىٰ بَنِي إِسْرَآءِ يٰلَ : بنی اسرائیل پر

صَبَرُوا : وہ لوگ ثابت قدم رہے

مَا : اس کو جو

فِرْعَوْنُ : فرعون

وَمَا : اور اس کو جو

نوٹ: فرعون کے جادوگر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہارنے کے بعد ان پر ایمان لے آئے تھے، لیکن فرعون اور اس کی قوم اسی طرح اپنی سرکشی اور کفر پر جمی رہی۔ تاریخی روایات کے مطابق اس واقعہ کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام بیس سال مصر میں مقیم رہ کر ان لوگوں کو اللہ کا پیغام سناتے اور حق کی دعوت دیتے رہے اس عرصہ میں ان لوگوں پر مختلف عذاب آتے رہے، جن کے ذریعہ قوم فرعون کو متنبہ کرنا اور راہ راست پر لانا مقصود تھا۔ ان میں سے ہر عذاب ایک معین وقت تک رہتا، پھر موقوف ہوتا اور کچھ مہلت دی جاتی کہ غور و فکر کر کے سنبھل جائیں۔ اسی طرح وقفہ وقفہ سے متعدد عذاب آتے رہے، لیکن ان لوگوں نے ان سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ پھر جب ہر

طرح اتمام حجت ہوگئی تب ان کو غرق کیا گیا۔ (معارف القرآن)

نوٹ ۲: زیر مطالعہ آیت ۱۳۷ میں ارشاد ہے کہ ہم نے اس کو برباد کر دیا جو فرعون اور اس کے پیروکار بنایا کرتے تھے۔ یہاں بنانے کے لیے یَصْنَعُ کا لفظ آیا ہے جس کے معنی کسی کام کو مہارت سے کرنے کے ہیں۔ (مفردات القرآن) بظاہر اس سے مراد ان کی عمارتیں ہیں، کیونکہ یہ مصریوں کا خاص ذوق تھا اور انہوں نے فن تعمیر میں بڑی مہارت حاصل کر لی تھی۔ لیکن سورۃ الاعراف کی ان آیات میں اور قرآن مجید کے دیگر مقامات پر جہاں قوم فرعون پر عذابوں کا ذکر ہے، وہاں زلزلہ یا کسی ایسے عذاب کا ذکر نہیں ہے جس سے عمارتیں تباہ ہوں۔ اس لیے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ غالباً یہاں یَصْنَعُ کا لفظ اپنے عمومی مفہوم میں آیا ہے اور اس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف وہ جھوٹے الزامات ہیں جو فرعون گھڑا کرتا تھا اور قوم اس کی ہاں میں ہاں ملاتی تھی۔ شاید اسی لیے یَصْنَعُ کے فاعل کے طور پر فرعون اور اس کی قوم کا الگ الگ ذکر آیا ہے۔ کیونکہ الزامات فرعون گھڑتا تھا اور قوم اس کی ہم نوا ہوتی تھی۔ مثلاً یہ کہ یہ جادوگر تم لوگوں کو تمہاری زمین سے نکالنا چاہتا ہے، تمہاری بے مثال تہذیب کو تباہ کرنا چاہتا ہے، جادوگروں کی شکست ان کی اور موسیٰ علیہ السلام کی ملی بھگت کا نتیجہ تھی، موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے عذاب ٹل جانے پر وعدہ نہ پورا کرنے کے لیے حیلے بہانے تراشنا، وغیرہ وغیرہ۔ یَصْنَعُ کا اگر یہ مفہوم ہے تو پھر یَعْرِشُونَ کو بھی اس کے عمومی مفہوم پر محمول کرنا ہوگا اور اس کا مطلب یہ ہوگا کہ فرعون جو کچھ گھڑتا تھا، حکومت کی مشینری پر پیکیڈے کے ذریعے اسے لوگوں کے ذہنوں پر مسلط کر دیتی تھی تاکہ لوگوں کو موسیٰ علیہ السلام کی رسالت اور بنو اسرائیل کی آزادی کے مطالبہ کی صداقت پر غور کرنے کا موقع نہ ملے۔ واللہ اعلم بالصواب!

مفتی محمد شفیع کی رائے ہے کہ یَصْنَعُ کے مفہوم میں فرعون اور قوم فرعون کی بنائی ہوئی چیزوں میں ان کے مکانات و عمارات اور گھریلو ضرورت کے سامان، نیز وہ مختلف قسم کی تدبیریں جو وہ موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کے لیے کرتے تھے سب داخل ہیں۔ (معارف القرآن)



شرک کی حقیقت، اقسام اور دور حاضر
کے شرک سے واقفیت کے لیے مطالعہ کیجئے

حقیقت و اقسام شرک

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

اشاعت خاص 100 روپے، اشاعت عام 60 روپے

انفاق فی سبیل اللہ اور قرضہ

مدّرس : پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ :
 ((لَوْ كَانَ لِي مِثْلُ أُحُدٍ ذَهَبًا لَسَرَنْتَنِي أَنْ لَا تَمُرَّ عَلَيَّ ثَلَاثَ لَيَالٍ وَعِنْدِي مِنْهُ شَيْءٌ إِلَّا شَيْءٌ أُزِصُّهُ لِدِينٍ)) (متفق عليه)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”اگر میرے پاس احد پہاڑ کے برابر بھی سونا ہوتا تو مجھے یہ گوارا نہ ہوتا کہ تین راتیں گزر جائیں اور وہ تمام سونا یا اس کا کچھ حصہ میرے پاس موجود رہتا سوائے بقدر ادائے قرض کے۔“

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ اپنی خواہش بتا رہے ہیں کہ اگر میرے پاس احد پہاڑ کے برابر بھی سونا ہوتا تو میں یہ گوارا نہ کرتا کہ یہ مال یا اس کا کچھ حصہ تین دن تک میرے پاس پڑا رہے اور میں اسے خرچ نہ کروں۔ ہاں اگر مجھ پر قرض ہوتا تو قرض کی ادائیگی کی مقدار اس میں سے میں اپنے پاس رکھ لیتا اور قرض ادا کر دیتا۔ رسول اللہ ﷺ راہِ خدا میں مال و دولت خرچ کرنے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں اور اپنا اُسوۂ حسنہ پیش فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے کہ مالدار لوگ اپنی جائز ضروریات پوری کرنے کے بعد جو مال بچے اسے اللہ کی راہ میں غریبوں، مسکینوں، ضرورت مندوں اور ناداروں میں تقسیم کر دیں یا رفاہ عامہ کے کاموں میں لگا دیں۔ اسلام کا یہ سنہری اصول ہے۔ اگر مالدار لوگ اپنی دولت کا معتد بہ حصہ ضرورت مندوں پر خرچ کر دیں تو گداگری ختم ہو جائے۔

مال و دولت اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے، وہ جس کو چاہتا ہے زیادہ دولت دیتا ہے، جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے۔ مالدار انسان شیطان کے بہکاوے میں آ جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ مال و دولت میری محنت اور دشمنی کا نتیجہ ہے۔ اگر میں اسے خواہ مخواہ دوسرے لوگوں پر خرچ کروں گا تو میرا مال کم ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ زیادہ سے زیادہ مال سمیٹتا اور گن گن کر رکھتا ہے اور بالآخر اپنی موت کے وقت یہ سارا مال چھوڑ کر قبر میں جا پہنچتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿الْهَلِكُمْ التَّكَاتُرُ ۝ حَتَّىٰ زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝﴾ (التکاتُر) ”مال کی کثرت کی خواہش نے تمہیں غفلت میں ڈالے رکھا، یہاں تک کہ تم نے قبریں جا دیکھیں۔“ انسان مال جمع کرنے میں مگن رہتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ کسی وقت بھی موت آ سکتی ہے اور اس کا یہ مال پڑے کا پڑا رہ جائے گا اور وہ بے بس ہو کر قبر میں چلا جائے گا۔

اگر کسی نے اپنا مال گن گن کر رکھا اور یہ سمجھا کہ یہ مال میرے پاس ہمیشہ رہے گا اور مجھ سے جدا نہیں ہوگا،

وہ سخت غلط فہمی میں ہے اور یہ سوچ اسے آگ میں ڈال دے گی۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝۱ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۝۲ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۝۳ كَلَّا لَيُبَذَّنَ فِي الْحُطَمَةِ ۝۴ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝۵ نَارُ اللَّهِ الْمَوْقُودَةُ ۝۶﴾ (الہمزہ) ”خرابی ہے ہر طعنہ دینے والے عیب چننے والے کی“ جس نے مال میٹھا اور گن گن کر رکھا۔ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال سدا اس کے ساتھ رہے گا۔ ہرگز نہیں وہ پھینکا جائے گا حطمہ میں۔ اور آپ کیا جانیں کہ حطمہ کیا ہے؟ وہ اللہ کی سلگائی ہوئی آگ ہے۔“

رسول اللہ ﷺ اپنی چاہت اور اپنا طریقہ بتا رہے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے اور اپنی ضرورتوں کے مطابق ہی پاس رکھا جائے، کیونکہ انسان کے کام وہی مال آئے گا جو اس نے فی سبیل اللہ خرچ کر کے آخرت کے لیے ذخیرہ کر لیا۔ رسول اللہ ﷺ ایک دفعہ ایک بکری ذبح کر کے گھر میں چھوڑ گئے اور فرمایا کہ اس کا گوشت ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ازواج مطہرات نے ایسا ہی کیا، البتہ ایک دستی اپنے استعمال کے لیے رکھ لی۔ رسول اللہ ﷺ واپس گھر تشریف لائے تو پوچھا کہ گوشت میں سے کچھ باقی بچا؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ اُس میں سے ایک دستی کے سوا کچھ باقی نہیں بچا۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ((بَقِيَ كُلُّهَا غَيْرَ كَيْفِهَا)) ”وہ سارا گوشت بچ گیا سوائے اس کی دستی کے۔“ (جامع ترمذی) یعنی جو گوشت آپ نے فی سبیل اللہ تقسیم کر دیا وہ ہمارے لیے آخرت میں ذخیرہ ہو گیا اور جو ہم نے اس میں سے کھالیا وہ تو consume ہو گیا۔

مال جمع کر کے رکھنا اور اسے فی سبیل اللہ ضرورت مندوں پر خرچ نہ کرنا بڑی خطرناک غفلت ہے۔ جس کے پاس جتنا مال جمع کیا ہوا ہوگا اس سے اس کے بارے میں سوال ہوگا کہ یہ مال کہاں سے کمایا تھا اور کہاں خرچ کیا؟ جس نے جائز طریقے سے کمایا ہوگا وہ اس سوال کا جواب دے کر بچ جائے گا۔ مگر جب خرچ کی تفصیلات پوچھی جائیں گی تو صرف وہی بچ سکیں گے جنہوں نے اپنی ناگزیر دنیوی ضروریات پر خرچ کیا اور کثرت کے ساتھ اپنا مال اللہ کی رضا کے لیے خرچ کر کے آخرت کے لیے ذخیرہ بنالیا۔

مال و دولت اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ یہ مال زیادہ سے زیادہ اُس کی راہ میں خرچ کیا جائے تاکہ وہ بندے کے لیے آخرت میں نجات اور درجات کی بلندی کا سبب بن جائے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”روزانہ صبح کے وقت دو فرشتے اترتے ہیں، ان میں ایک فرشتہ تو خرچ کرنے والے کے لیے یہ دعا کرتا ہے: اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا“ اے اللہ! خرچ کرنے والے کو بدل عطا فرما۔ اور دوسرا فرشتہ بد دعا کرتا ہے کہ اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُمَسِّكًا تَلَفًا“ اے اللہ! بخیل کا مال تلف کر دے۔“ (متفق علیہ) گویا فرشتے خرچ کرنے والے کے لیے اللہ کی خوشنودی اور بخیل کے لیے اللہ تعالیٰ کی ناراضی کی دعا کرتے ہیں۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ مال جائز ذرائع سے کمایا گیا ہو، کیونکہ ناجائز مال کو خرچ کرنا چنداں مفید نہ ہوگا۔ ناجائز طریقے سے کمایا ہوا مال تو خود ناپاک ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ہاں نامقبول ہے۔ اللہ تعالیٰ تو پاکیزہ اور صاف ستھری چیزوں کو ہی قبول کرتا ہے۔ حرام طریقوں سے کمائی ہوئی روزی تو سراسر وبال ہے۔ اس سے بچنا

ضروری ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ دعا قبول نہیں ہوتی۔ جب دعا مانگنے والے کی کمائی حرام ہے تو اس کمائی کو کھانے والے کی دعا کیسے قبول ہوگی! حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے شخص کا ذکر کیا جو طویل سفر کرتا ہے، پرانگندہ بال اور غبار آلودہ ہے، اپنے دونوں ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھاتا ہے اور کہتا ہے اے پروردگار! اے پروردگار! (یعنی دعا مانگتا ہے) حالانکہ اس کا کھانا حرام اس کا پینا حرام اس کا لباس حرام اور حرام ہی میں اس کی پرورش ہوئی ہے۔ پھر اس کی دعا کیونکر قبول کی جائے! (صحیح مسلم)

اس سے معلوم ہوا کہ انفاق مال اور دوسری عبادات کے لیے روزی کا جائز طریقوں سے حصول اولین شرط ہے، ورنہ نماز قبول نہ روزہ۔ جبکہ حلال کمائی سے خرچ کرنا اجر و ثواب کا باعث ہے۔ جو لوگ جائز طریقوں سے کماتے ہیں ان کی روزی میں برکت ہوتی ہے، تھوڑی آمدنی بھی کافی ہو جاتی ہے۔ پھر جو لوگ فراخ دلی کے ساتھ خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ بھی انہیں فراخ روزی دیتا ہے۔ یہ تو شیطان ہے جو انسان کو ورغلا تا ہے کہ اگر خرچ کرو گے تو تمہارا جمع کیا ہوا مال ختم ہو جائے گا، اگر سود لو گے تو تمہاری آمدنی بڑھ جائے گی۔ مگر قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿يُمَحِّقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُزِيلُ الصَّدَقَاتِ ط﴾ (البقرة: ۲۷۶) ”اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے“۔ گویا جو سود کھاتا ہے وہ کبھی زندگی میں آسودہ نہیں ہوتا اور آخرت میں اللہ کے عذاب کا نشانہ بنے گا۔ جبکہ خیرات و صدقات میں مال خرچ کرنے والا دنیا میں سکون و اطمینان حاصل کرے گا اور آخرت میں اسے انعاماتِ الہی سے نوازا جائے گا۔

دو میاں بیوی خوشحال تھے۔ ان کی بستی کے قریب سے ایک سڑک گزرتی تھی۔ انہوں نے مسافروں کے فائدے کے لیے سڑک کے کنارے چھاؤں کا انتظام کر دیا۔ پھر سوچا کہ وہاں پینے کے پانی کا بھی انتظام کر دیں، چنانچہ انہوں نے وہاں پانی کا ٹنکا لگوا دیا۔ انہوں نے ارادہ کیا کہ وہاں کھانے کا بھی بندوبست کر دیں تاکہ مسافر اور ان کے بچے جھوک مٹا سکیں۔ میاں کو ایک دوست نے کہا کہ کھانے کا بندوبست تو غیر ضروری ہے، تم خواہ مخواہ اپنی دولت لٹا رہے ہو۔ شوہر نے اپنی بیوی سے بات کی اور کہا کہ واقعی کھانے کا بندوبست مناسب نہیں۔ عورت یہ سن کر خاموش رہی۔ چند دن کے بعد وہ اپنے بچوں سمیت اپنے فارم میں گئے جہاں ایک رہٹ چل رہا تھا۔ جب واپس گھر جانے لگے تو عورت کنویں میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ مرد نے آواز دی کہ انھیں گھر کا رستہ لیں۔ کہنے لگی ذرا ٹھہرو۔ مرد نے پھر آواز دی۔ عورت نے پھر وہی کہا۔ مرد نے کہا تم آ نہیں رہی، کس چیز نے تم کو روک رکھا ہے؟ عورت بولی: لگا تار اتنا پانی تیزی کے ساتھ کنویں سے نکل رہا ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ ابھی کنویں کا پانی ختم ہو جائے گا تو چلتے ہیں۔ مرد نے کہا: اللہ کی بندی! کنواں کبھی خالی نہیں ہوگا۔ جتنا پانی نکلتا جاتا ہے اس سے زیادہ پانی نیچے سے کنویں میں آ جاتا ہے۔ عورت کہنے لگی: اللہ کے بندے! جب ہم اپنی دولت لوگوں کے آرام و سکون کے لیے خرچ کریں گے تو مال کم نہیں ہوگا، بلکہ مال میں اضافہ ہوگا۔ مرد عورت کی دانش مندی پر خوش ہوا اور رفاد عامہ کے کاموں میں دولت بے دریغ خرچ کرنے لگا۔ یوں عورت نے حکمت کے ساتھ مرد کو باور کرا دیا کہ راہِ خدا میں مال خرچ کرنے سے مال میں کمی نہیں آتی بلکہ مال بڑھتا ہے۔ قرآن مجید

میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لَنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ﴾ (ابراہیم: ۷) ”اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں لازماً تمہیں اور زیادہ دوں گا۔“ مال کا شکریہ یہی ہے کہ اسے اللہ کی مرضی کے مطابق خرچ کیا جائے۔

قرض کی سنگینی کا اندازہ کیجیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے پاس اُحد پہاڑ کے برابر سونا بھی ہو تو تمام سونا تقسیم کر دوں گا۔ البتہ میرے ذمہ قرض ہو تو اس کی ادائیگی کی مقدار سونا رکھ لوں گا۔ کسی ضرورت مند کو قرض دینا بہت بڑی نیکی ہے اور جو قرض لے اس کے لیے ضروری ہے کہ جلد از جلد قرض چکانے کی کوشش کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”مؤمن بندے کی روح اس کے قرض کی وجہ سے بیچ میں معلق رہتی ہے جب تک وہ قرض نہ ادا کر دیا جائے جو اس پر ہے۔“ (ترمذی) حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”شہید ہونے والے مرد مؤمن کے سارے گناہ بخش دیے جاتے ہیں، بجز قرض کے۔“ گویا اللہ کی راہ میں جان قربان کرنے والا بھی جنت میں نہیں جاسکتا جب تک اس کا قرض نہ ادا کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جنازہ کی نماز پڑھنے سے پہلے میت کے وارث پوچھتے ہیں کہ اس نے کسی کا قرضہ دینا ہو تو ہم سے رابطہ کرے اور لے لے۔

رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا کہ جب کوئی جنازہ آتا تو پوچھ لیتے کہ اس کے ذمہ کوئی قرض تو نہیں؟ اگر قرض ہوتا تو اس کا جنازہ پڑھنے سے گریز کرتے۔ ایک دفعہ ایک جنازہ آیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ”اس کے ذمہ قرض ہے؟“ بتایا گیا نہیں۔ تو آپ نے اس کا جنازہ پڑھا دیا۔ پھر ایک اور جنازہ لایا گیا، آپ نے پوچھا: ”اس کے ذمہ قرض ہے؟“ بتایا گیا ہاں۔ پوچھا: ”یہ کچھ چھوڑ کر مرا ہے؟“ بتایا گیا کہ ہاں تین دینار۔ پس آپ نے اس کا جنازہ پڑھا دیا۔ پھر تیسرا جنازہ لایا گیا۔ آپ نے پوچھا: ”اس کے ذمہ قرض ہے؟“ بتایا گیا ہاں تین دینار۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم خود ہی اپنے ساتھی کا جنازہ پڑھ لو۔“ یہ سن کر ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ”یا رسول اللہ! اس کا جنازہ پڑھا دیجیے۔ اس کے قرض کا ذمہ میں لیتا ہوں۔“ چنانچہ آپ ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھا دی۔ کتنی بد نصیبی کی بات ہے کہ جو شخص قرض کا بار لے کر مرا ہو اُس کے لیے رسول اللہ ﷺ مغفرت کی دعا کرنے (یعنی نماز جنازہ پڑھنے) سے گریز کر رہے ہیں، حالانکہ آپ ﷺ رحمۃ للعالمین ہیں۔ ❀❀❀

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت، اہمیت و لزوم اور مراحل و مدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جامع خطاب

اشاعت عام: 15 روپے

اشاعت خاص: 40 روپے

قرآنی مکالمے

اسلوب، حکمت اور عصری معنویت

مجتبیٰ فاروق ☆

قرآن مجید دنیائے انسانیت کے لیے آخری کتاب ہدایت ہے۔ یہ جملہ کتب الہی میں محفوظ ترین کتاب ہے جو ہر قسم کی تحریف سے پاک ہے۔ یہ رشد و ہدایت کا سرچشمہ ہے اور زندگی کے ہر شعبے کے لیے ایسی رہنمائی کرتی ہے جس کے بعد فرد کو کسی دوسرے مذہب یا نظریہ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہی وہ کتاب ہے جو انسان کو کفر و ضلالت اور ہر قسم کی خرافات سے نکال کر راہِ حق اور الہامی روشنی کی طرف لے آتی ہے۔ اس کتاب نے انسانیت کو ہدایت کی طرف دعوت دینے کے لیے مختلف پیرائے اور اسلوب (methods and styles) اختیار کیے اور دلائل کے مختلف پہلوؤں کو عمدہ طریقوں سے ظاہر کیا، تاکہ ہر انسان صراطِ مستقیم پر چلے اور قرآنی روشنی سے اپنی زندگی کو منور کرے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿أَنْظُرْ كَيْفَ نَصَرَفَ الْآيَاتِ ثُمَّ هُمْ يَصْذِقُونَ﴾ (الانعام)

”دیکھو ہم کیسے مختلف طریقوں سے دلائل بیان کرتے ہیں اور پھر بھی یہ بے رخی کیے ہوئے ہیں۔“

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

﴿وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هَذَا الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ﴾ (بنی اسرائیل: ۸۹)

”اور ہم نے قرآن میں لوگوں کو سمجھانے کے لیے ہر طرح کی مثالیں بیان کی ہیں۔“

مزید فرمایا:

﴿وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَذَا الْقُرْآنِ لِيَذَّكَّرُوا﴾ (بنی اسرائیل: ۴۱)

”ہم نے اس قرآن میں ہر طرح طرح سے لوگوں کو سمجھایا تاکہ ہوش میں آئیں۔“

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو راہِ حق کی طرف دعوت دینے کے لیے ہر طرح کا اسلوب اختیار کیا، جن میں سے ایک حوار (dialogue) بھی ہے۔ حوار (مکالمہ) ایک انتہائی مؤثر، پُرکشش اور آسان اسلوب ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ لوگوں کو رشد و ہدایت کی طرف دعوت دیتا ہے۔

قرآن کریم میں باہمی گفتگو یا مکالمہ کے لیے ”حوار“ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ الحوار یا محاورہ کے معنی گفتگو بات چیت رد و قدح اور مکالمہ کے ہیں۔ ^(۱) حوَار حَارَ يَحْوِرُ سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی لوٹنا یا لوٹانا کے ہیں یعنی بات لوٹانا اور ایک دوسرے سے تبادلہ خیال یا گفتگو کرنا۔ اس حوالے سے قرآن مجید کی ایک آیت ہے: ﴿إِنَّهُ ظَنَّ أَنْ لَنْ يَحْوِرَ﴾ (الانشقاق) یعنی اس نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ وہ کبھی پلٹ کر (اللہ کے سامنے) نہیں جائے گا۔ ^(۲) اس آیت کی تشریح میں جلالین میں یہ مذکور ہے يَرْجِعُ إِلَىٰ رَبِّهِ ^(۳) یعنی اس نے گمان کیا تھا کہ وہ کبھی اپنے رب کی طرف نہیں لوٹے گا۔ امام جوزی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے: لَنْ يَرْجِعَ إِلَىٰ الْآخِرَةِ ^(۴) یعنی اس نے گمان کر رکھا تھا کہ وہ آخرت کی طرف کبھی نہیں لوٹے گا۔

امام راغب اصفہانی نے اپنی موقر کتاب میں لکھا ہے: المحاورۃ والحوار المرادۃ فی الکلام ومنہ التحوار قال اللہ تعالیٰ ”وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَ كُمَا“ و کلمتہ بما رجع الی حوار ^(۵) ”حوار کے معنی گفتگو کو آپس میں دہرانے کے ہیں اور اسی سے التحوار ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا ہے“ اور میں نے اس سے لوٹنے کے لیے کہا ہے۔ علامہ محمد اسد نے بھی إِنَّهُ ظَنَّ أَنْ لَنْ يَحْوِرَ کا یہی ترجمہ کیا ہے:

He would have never thought that he would have to return (to God) ^(۶)

قرآن مجید میں حوار کا لفظ چار مقامات پر وارد ہوا ہے:

(۱) ﴿إِنَّهُ ظَنَّ أَنْ لَنْ يَحْوِرَ﴾ (الانشقاق)

(۲) ﴿فَقَالَ لِصَاحِبِهِ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَنَا أَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَأَعَزُّ نَفَرًا﴾ (الکھف)

(۳) ﴿قَالَ لَهُ صَاحِبُهُ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَكَفَرْتَ بِالَّذِي خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ﴾ (الکھف: ۳۷)

(۴) ﴿وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَ كُمَا﴾ (المجادلة: ۱)

حوار کو انگریزی میں dialougue کہتے ہیں۔ Oxford Urdu Dictionary میں اس کے معانی، گفتگو کلام اور مکالمہ کے ہیں اور یہ بھی ہے:

Long dialougues between the two main charecters ^(۷)

یعنی دو نمایاں کرداروں کے درمیان طویل مکالمے۔

مکالمہ یا حوار ایسی گفتگو کا نام ہے جس کے ذریعے سے حقیقی راستے تک پہنچا جاسکتا ہے عیسیٰ رضیدی اس حوالے سے رقمطراز ہیں:

Dialougue is a kind of conversation and intraction that follow a path and looking for a goal and to reach the truth ^(۸)

”حوار طرفین کی باہمی گفتگو پر مبنی ہوتی ہے اور یہ گفتگو حق کی طرف پیش قدمی کرنے کی طرف ہوتی ہے اور اس کا بنیادی مقصد اور ہدف منزل مقصود تک پہنچنے کی کوشش کرنا ہوتا ہے۔“

صالح بن عبد اللہ لکھتے ہیں: يراَد بالحوار المناقشة بين طرفين او الاطراف، يقصد بها تصحيح كلام و اظهار حجة و اثبات حق، و دفع شبهة و ردّ الفاسد القول^(۹) یعنی حوار فریقین کے درمیان بحث و مباحثہ جس سے گفتگو کی درستگی اور اصلاح مقصود ہو، دلیل کو بیان کرنے، شکوک و شبہات کو رفع کرنے اور غلط و دلیل یا گفتگو دور کرنے کو کہتے ہیں۔

حوار یا مکالمہ باہمی گفتگو کا ایک ایسا ذریعہ ہے جس میں ایک کی حیثیت متکلم کی ہوتی ہے جب کہ دوسرے کی حیثیت سامع یا مخاطب کی۔ اس میں اول الذکر گفتگو کا آغاز کرتا ہے اور مخاطب ہو کر بات کرتا ہے، جبکہ دوسرا عموماً اس کی بات توجہ سے سنتا ہے، پھر وہ اس کی بات کا جواب دیتا ہے۔ اس میں مخاصمت، نزاع اور جرح کا کوئی عمل دخل نہیں ہونا چاہیے، بلکہ باہمی محبت و الفت اور عزت و اکرام کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ نیز الزامات اور طعن و تشنیع سے بھی بالکل گریز کیا جائے۔ اس کے علاوہ خوشگوار انداز، تعلقات اور ماحول میں مکالمہ کیا جائے اور خوش اسلوبی کو اختیار کیا جائے۔

قرآن مجید میں مکالمہ آرائی خوب ہوئی ہے۔ ان مکالموں میں بنیادی اصولوں اور باتوں کو واضح کرنے کے لیے تکرار بھی پایا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں مکی سورتوں کے پہلے دور میں مکالمے زیادہ نہیں پائے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ قریش اور مشرکین مکہ نے رسول اللہ ﷺ کے پیغام اور دعوت کو نظر انداز کیا تھا۔ اس کے بعد مکی سورتوں کا دوسرا اور تیسرا دور مکالموں سے بھرا ہوا ہے۔ ان مکالموں میں بہت سی باتوں اور اصولوں کی پرزور انداز میں وضاحت ملتی ہیں اور ساتھ ہی ربط و نظم اور تسلسل کے ساتھ مکالموں کی اہمیت و افادیت بھی ابھر کر سامنے آتی ہے۔ مدنی سورتوں میں مکالمے (dialogues) اسلامی ریاست قائم ہونے کے بعد بہت کم تعداد میں استعمال ہوئے ہیں، لیکن مجموعی طور پر قرآن مجید میں لوگوں کو صراطِ مستقیم کی طرف دعوت دینے کے لیے مکالمے ایک انتہائی اہم ذریعہ ہیں۔ قرآن مجید میں سورۃ الشعراء، سورۃ ہود، سورۃ یوسف، سورۃ طہ، سورۃ الکہف، سورۃ نوح اور سورۃ الانبیاء زیادہ تر مکالموں پر مشتمل ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد سورتیں اور آیتیں ہیں جو حوار کا طرز اختیار کیے ہوئے ہیں اور بہترین منہج کے ساتھ ساتھ عقلی دلائل بھی فراہم کرتی ہیں۔

قرآنی مکالموں کی اقسام

قرآنی مکالموں کی بہت سی انواع موجود ہیں۔ پروفیسر مستنصر میر قرآنی مکالموں کو پانچ اقسام میں تقسیم کرتے ہیں۔^(۱۰) یہ پانچ اقسام اس طرح ہیں:

(۱) پیغمبر اور اس کی قوم کے درمیان مکالمہ: پیغمبر اور اس کے قوم کے درمیان مکالمہ قرآن مجید میں سب سے زیادہ مستعمل ہے۔ اس قسم کے مکالموں میں پیغمبر عموماً اپنی قوم کو پیغامِ حق سے واقف کراتا ہے جس کو اس کی قوم یا تو نظر انداز کرتی ہے یا پھر مخالفت پر اتر آتی ہے۔ اس طرح کے متعدد مکالمے سورۃ ہود اور سورۃ الشعراء میں ہیں۔ (دیکھئے الشعراء: ۲۶، ۶۹، ۸۲، ۱۴۱ تا ۱۵۱)

(۲) اللہ اور پیغمبر کے مابین مکالمہ: یہ مکالموں کی دوسری قسم ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کے درمیان ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے ہیں کہ آپ مُردوں کو کیسے زندہ کرتے ہیں؟ (البقرہ: ۲۶۰) اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے اپنا جلوہ دکھانے کے لیے عرض کرتے ہیں۔ (القصص: ۲۹ تا ۳۵) (۳) بہت سے مکالمے ایسے بھی ہیں جو آخرت میں وقوع پذیر ہوں گے۔ (دیکھئے: اہل جنت اور اہل دوزخ کے درمیان مکالمے۔ (المذثر: ۴۰ تا ۴۷ الاعراف: ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۵۰)

(۴) مکالموں کی ایک اور قسم جس میں بولنے والا دوسروں سے اہم معاملات میں مشورہ کرتا ہے۔ (دیکھئے ملکہ سبا اپنے درباریوں سے اس بات پر مشورہ کرتی ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے خط کا کیسے جواب دیا جائے) (النمل: ۲۹ تا ۳۵) یا حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی آپس میں مشورہ کرتے ہیں کہ یوسف کو ہم کیسے قابو میں رکھ کر اپنے والد کی قربت حاصل کر سکیں۔ (یوسف: ۱۰ تا ۱۸)

(۵) مکالموں کی ایک قسم وہ بھی ہے جو یک طرفہ ہوتا ہے یعنی جس میں بولنے والا ایک ہی ہوتا ہے باقیوں کی حیثیت سامعین کی ہوتی ہے۔ (مثلاً حضرت لقمان علیہ السلام کی انمول نصیحتیں (لقمان: ۱۲ تا ۱۹) یا اللہ تعالیٰ پہلے ابلیس اور پھر حضرت آدم و حوا علیہما السلام سے مخاطب ہوتا ہے (البقرہ: ۳۴ تا ۳۹) قرآن مجید میں چند اہم حوار (مکالمے) حسب ذیل ہیں:

- (۱) اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے درمیان حوار۔
 - (۲) حضرت نوح علیہ السلام کا اپنی قوم کے ساتھ حوار۔
 - (۳) حضرت ہود علیہ السلام اور ان کی قوم کے مابین حوار۔
 - (۴) حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی قوم کے درمیان حوار۔
 - (۵) حضرت شعیب علیہ السلام کا اپنی قوم کے ساتھ حوار۔
 - (۶) حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے والد اور پھر نمرود کے ساتھ حوار۔
 - (۷) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قوم اور فرعون کے ساتھ حوار۔
 - (۸) حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے درمیان حوار۔
 - (۹) حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کے درمیان حوار۔
 - (۱۰) ملحد اور موحد شخص کے درمیان حوار۔
 - (۱۱) حضرت یوسف علیہ السلام کا زندان کے ساتھیوں کے ساتھ حوار۔
 - (۱۲) حضرت لقمان علیہ السلام کا اپنے بیٹے کے ساتھ حوار۔
- چند قرآنی مکالموں کی تفصیل حسب ذیل ہیں:

اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے مابین حوار

قرآن مجید میں حضرت آدم علیہ السلام کا تذکرہ پچیس آیات میں پچیس بار آیا ہے اور ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جو مکالمہ کیا وہ مشہور و معروف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق کرنے کا ارادہ فرمایا تو اس وقت اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے درمیان حوار کافی اہمیت کا حامل ہے۔

سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةًۭۙ﴾

”اور یاد کرو وہ وقت جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔“

فرشتے نہایت عزت اور احترام سے کہنے لگے:

﴿اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَۙ﴾

”کیا آپ زمین میں ایسی مخلوق پیدا کریں گے جو اس میں فساد مچائے اور خون خرابہ کرے حالاں کہ ہم آپ کی تسبیح و تحمید اور تقدیس میں لگے ہوئے ہیں۔“

اللہ تعالیٰ نے ان کی اس الجھن کا اس طرح حکیمانہ جواب دیا:

﴿اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَۙ﴾ (البقرہ)

”میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔“

پھر اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو وہ سارے نام سکھائے جو فرشتے نہ جانتے تھے اور ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا:

﴿اٰتٰیۤنٰوْنِیْ بِاَسْمَآءِۙ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَۙ﴾ (البقرہ)

”بتاؤ مجھے ان چیزوں کے نام اگر تم سچے ہو۔“

اس پر فرشتوں کا حکیمانہ جواب یہ تھا:

﴿سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَاۙ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُۙ﴾ (البقرہ)

”آپ کی ذات پاک ہے، جو کچھ علم آپ نے ہمیں دیا ہے اس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے۔ حقیقت میں علم و حکمت کے مالک آپ ہی ہیں۔“

اس مکالمے میں یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہے اور ہر چیز کے متعلق علم رکھتا ہے اور وہ جو علم رکھتا ہے وہ کسی بھی مخلوق کے پاس نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ فرشتوں کو اس بات سے باخبر بھی کرانا مقصود تھا کہ آئندہ جو کام حضرت آدم علیہ السلام سے لینا ہے وہ ان کے بس کا نہیں ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو عملی طور پر یہ سکھایا کہ خلافت جیسا عظیم کام انسان سے ہی لینا ہے کیوں کہ بنی نوع انسان ہی اس کام کے اہل ہیں اور فرشتے یہ کام سرانجام نہیں دے سکتے۔

حضرت نوح علیہ السلام کا مکالمہ اپنی قوم کے ساتھ

قرآن مجید میں حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ کا اجمالی و تفصیلی ذکر ۶۳ مقامات پر آیا ہے۔ قوم نوح نہ صرف پیغام حق اور صراطِ مستقیم سے مکمل طور پر لاپرواہ ہو چکی تھی بلکہ بت پرستی میں بھی پوری طرح سے غرق تھی۔ قوم نوح کے سرداروں نے لوگوں کو گمراہ کیا اور ان سے کہا کہ بت پرستی کے عقیدے کو ہرگز بھی نہ چھوڑنا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح کو اس قوم کی طرف مبعوث فرمایا تو انہوں نے انہیں گناہوں سے بچنے کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا:

﴿اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ﴾ (الاعراف: ۵۹) ”اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو“۔ اور یہ بھی کہا:

﴿إِنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاتَّقَوْهُ وَأَطِيعُوا عَمَلَكُمْ﴾ (نوح) ”اے میری قوم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اسی سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔“

دعوتِ دین کا یہ عظیم کارِ خیر حضرت نوح علیہ السلام نے ۹۵۰ سال تک انجام دیا اور دن رات ایک کر کے صبح و شام مختلف صورتوں اور طریقوں سے ان سے بندگی رب اختیار کرنے کے لیے مباحثہ اور مکالمہ کرتے رہے۔ انہوں نے اپنی قوم سے انتہائی مہذب انداز اپناتے ہوئے فرمایا: ﴿إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ﴾ (ہود) ”میں آپ لوگوں کو واضح طور پر خبردار کرنے والا ہوں“۔ قوم نے جو جواب دیا وہ حضرت نوح علیہ السلام کے اس مہذب اور علمی بات چیت کے بالکل منافی تھا۔ قوم کا جواب اعتراضات کی صورت میں یہ تھا۔

(۱) ﴿مَا نَرَاكَ إِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا﴾ (ہود: ۲۷) ”ہماری نظر میں تو تم اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ بس ایک انسان ہو ہم جیسے۔“

(۲) ﴿وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَادُوا بُدَايَ الرَّئِیِّ﴾ ”اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں سے بس ان لوگوں نے جو ہمارے یہاں ارادہ کرتے تھے سوچے سمجھے تمہاری پیروی اختیار کر لی۔“

(۳) ﴿وَمَا نَرَاكَ إِلَّا كُنْزًا مِّنْ فَضْلٍ﴾ ”ہم کوئی چیز بھی ایسی نہیں پاتے جس میں تم لوگ ہم سے کچھ بڑھے ہوئے ہو۔“

(۴) ﴿بَلْ نَحْنُكُمْ كَاذِبِينَ﴾ (ہود) ”بلکہ ہم تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں۔“

یہاں تک کہ حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ یہ معاملہ بھی کیا گیا کہ

﴿كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا وَقَالُوا مَجْنُونٌ وَازْدُجِرَ﴾ (القمر)

”جھٹلایا تھا ان سے پہلے قوم نوح نے تو انہوں نے ہمارے بندے کو جھٹلایا اور کہا کہ یہ تو مجنون ہے اور اسے جھڑک دیا گیا۔“

حضرت نوح علیہ السلام نے ان چاروں اعتراضات کا جواب ایک ایک کر کے نہایت ہی عمدہ طریقے اور باحسن

مجادلہ دیا۔

پہلے اعتراض کا جواب:

﴿قَالَ يَقَوْمِ ارْأَوْا يَتَّبِعُنِي عَلَى بَيْتَةِ رَبِّي وَأَتَّبِعْ رَحْمَةً مِّنْ عِندِهِ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ أَنذَرْتُكُمْ هَٰذَا وَأَنْتُمْ لَهَا كِرْهُونَ ۖ﴾ (هود)

”نوح نے کہا: اے میری قوم کے لوگو! مجھے بتاؤ کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے کسی دلیل پر ہوں اور مجھے اس نے اپنے پاس سے کوئی رحمت عطا کی ہو پھر وہ تمہاری نگاہوں میں نہ آئی، تو کیا زبردستی میں اسے تمہارے گلے منڈھ دوں، حالانکہ تم اس سے بیزار ہو!“

دوسرے اعتراض کا جواب:

﴿وَيَقَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا إِنِّي أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ﴾ (هود: ۲۹)
”اور اے میری قوم! میں اس پر تم سے کوئی مال نہیں مانگتا، میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے۔“

تیسرے اعتراض کا جواب:

﴿وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّهُمْ مُّلْكُوا رَبِّهِمْ﴾ (هود: ۲۹)
”اور میں ایمان داروں کو اپنے پاس سے نہیں نکال سکتا، انہیں اپنے رب سے ملنا ہے۔“

آخری اعتراض کا جواب:

﴿وَلَا أَقُولُ لَكُمْ عِندِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ إِنِّي مَلَكٌ وَلَا أَقُولُ لِلَّذِينَ تَزْدَرِي أَعْيُنُكُمْ لَن يُؤْتِيَهُمُ اللَّهُ خَيْرًا.....﴾ (هود: ۳۱)

”اور میں تم سے یہ نہیں کہتا ہوں کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں، اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں کوئی فرشتہ ہوں، اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ جن پر تمہاری نگاہیں ذلت سے پڑ رہی ہوں انہیں اللہ تعالیٰ کوئی نعمت دے گا ہی نہیں.....“

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے اس پر مزید کہا:

﴿يُنُوحُ قَدْ جَدَلْنَا فَاكْثُرْتَ جِدَالَنَا فَإِنَّا بِمَا تَعِدُنَا إِن كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝﴾ (هود)
”اے نوح! ہم تمہارے ساتھ بہت زیادہ بحث و مباحثہ کر چکے، اب تو وہ عذاب لے ہی آؤ جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے ہو اگر تم سچے ہو۔“

قوم کے عذاب الہی کا مطالبہ کرنے کے بعد حضرت نوح علیہ السلام نے جواب دیا:

﴿إِنَّمَا يَأْتِيكُمْ بِهِ اللَّهُ إِن شَاءَ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ ۝﴾ (هود)
”وہ تو اللہ ہی لائے گا اگر چاہے گا اور تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو۔“

حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کو اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر سمجھاتے رہے، لیکن وہ قوم انتہائی ضدی، ہٹ دھرم، فاجر اور ظالم تھی۔ اُس نے حضرت نوح علیہ السلام کے پیغام حق اور نصیحت کو ایک بار بھی غور سے نہیں سنا اور بالآخر اس قوم کو اللہ تعالیٰ نے غرق کر دیا۔

یہ مکالمہ ایک داعی کو صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رکھنے کے لیے رہنما اصول فراہم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس مکالمے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ داعی حق کو اپنی ذات کے ساتھ ساتھ اپنے مشن اور نصب العین پر لگائے گئے

الزامات اور غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کرتے رہنا چاہیے جیسے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے کیا۔

حضرت ہود علیہ السلام اور قوم عاد کے مابین حواری

حضرت ہود علیہ السلام کا تذکرہ قرآن مجید میں ۷ بار آیا ہے اور سورہ ہود اور سورۃ الشعراء میں ان کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ ہوا ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے قوم عاد کی طرف بھیجا۔ قوم عاد انتہائی جابر سرکش توحید کے سخت مخالف اور بت پرست قوم تھی۔ یہ قوم اپنے آباء و اجداد کے دین پر سختی سے عمل پیرا تھی اور باپ دادا کے مذہب کو کسی بھی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس قوم کو اپنی قوت و طاقت پر بہت ناز اور غرور تھا۔ علاوہ بریں یہ قوم دوسری قوموں پر جبار بن کر حملہ کرتی تھی۔ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو خوف و تقویٰ اور بندگی رب کی طرف دعوت دیتے ہوئے فرمایا:

﴿يَقُومُوا عَبْدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ إِنَّكُمْ أَنْتُمْ الْأَمْتُونَ ۝۵۰﴾ (ہود)

”اے میری قوم! اللہ کی بندگی اختیار کرو اس کے سوا تمہارا کوئی الہ نہیں ہے تم نے محض جھوٹ گھڑ رکھے ہیں۔“

مزید فرمایا:

﴿لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِنْ أَجَرِيَ إِلَّا عَلَى الَّذِي فَطَرَنِي ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝۵۱﴾ (ہود)

”اس کام پر میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا، میرا اجر تو اس کے ذمہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا۔ کیا تم عقل سے ذرا بھی کام نہیں لیتے؟“

حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی گفتگو جو انتہائی علمی، عقلی اور ان کے ضمیروں کو جھنجھوڑنے والی تھی جاری رکھی اور فرمایا:

﴿وَيَقُومُوا اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِينَ ۝۵۲﴾ (ہود)

”اور اے میری قوم کے لوگو! اپنے رب سے معافی چاہو پھر اس کی طرف پلٹو..... اور مجرم بن کر منہ نہ موڑو۔“

اس کے بعد قوم عاد نے جو جواب دیا وہ قرآن مجید نے اس طرح محفوظ کر رکھا ہے:

﴿يَهُودُ مَا جِئْنَا بِبَيِّنَةٍ وَمَا نَحْنُ بِتَارِكِي آلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ ۝۵۳﴾ (ہود)

”اے ہود! تو ہمارے پاس کوئی روشن دلیل لے کر نہیں آیا اور تیرے کہنے سے ہم اپنے خداؤں کو چھوڑنے والے نہیں ہیں اور نہ ہم تجھ پر ایمان لانے والے ہیں۔“

انہوں نے صریح طور پر حضرت ہود علیہ السلام اور ان کی دعوت حق کو جھٹلایا۔ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو ہر قسم کے عقلی اور نقلی دلائل پیش کیے، لیکن ان کے دلوں اور عقلوں پر گمراہی کے پردے پڑے ہوئے تھے اس لیے انہوں نے حضرت ہود علیہ السلام کی ہر نصیحت کو پس پشت ڈالا۔ حضرت ہود علیہ السلام نے قوم عاد کو ان تمام صلاحیتوں اور عنایتوں کی یاد دہانی بھی کرائی جن سے اللہ تعالیٰ نے انہیں نوازا تھا۔ مثلاً وہ لوگ چٹانوں میں بڑے بڑے محل تراشتے تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں کثیر تعداد میں جانور دیئے اولاد دیں باغ اور چشمے دیئے ان سب کے باوجود قوم عاد نے جواب دیا:

﴿سَوَاءٌ عَلَيْنَا أَوَعَضْتَ أَمْ لَمْ تَكُنْ مِنَ الْوَاعِظِينَ﴾ (۳) ﴿إِنْ هَذَا إِلَّا خُلُقُ الْأَوَّلِينَ﴾ (الشعراء)
 ”چاہے تم نصیحت کرو یا نہ کرو ہمارے لیے سب برابر ہے۔ یہ باتیں تو وہی ہیں جو پچھلے لوگوں کی عادت رہی ہیں۔“

بالآخر اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو ضد، ہٹ دھرمی اور ظلم کی بدولت ہلاک کر کے دنیائے انسانیت کے لیے سامانِ عبرت بنادیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کے درمیان حوار

قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ پچیس سورتوں میں ۶۹ دفعہ آیا ہے اور ان کے متعدد مکالموں کا تذکرہ بھی ہے۔ ان میں سے ایک مکالمہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمرود کے ساتھ ہوا تھا جو اُس وقت عراق کا بادشاہ تھا۔ نمرود خدائی کے دعویدار ہونے کے ساتھ ساتھ موت و حیات کا مالک بھی بن بیٹھا تھا۔ یہ دونوں دعوے انتہائی متکبرانہ اور بے وقوفانہ تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان دونوں دعوؤں کا ایسا جواب دیا کہ نمرود ششدر رہ گیا۔ قرآن مجید نے اس اہم مکالمے کو ان الفاظ میں بیان کیا:

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ﴾ (البقرة: ۲۵۸)
 ”کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور کیا جس کو اللہ تعالیٰ نے سلطنت کیادی تھی کہ وہ اپنے رب (کے وجود ہی) کے بارے میں ابراہیم سے بحث کرنے لگا۔“

اُس نے ابراہیم علیہ السلام سے کج حجتی کی بنا پر یہ سوال کیا کہ آپ کا رب کون ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب کا بہت ہی جامع تعارف ان الفاظ میں کرایا:

﴿رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ﴾ (البقرة: ۲۵۸)

”میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے۔“

اس پر نمرود نے تکبر، ہٹ دھرمی اور ذاتی مفاد کی بنا پر کہا کہ زندگی اور موت میرے اختیار میں بھی ہے۔ اس سوال کے جواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے احسن مجادلہ اختیار کیا جس سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو گیا اور حقیقت بالکل نکھر کر سامنے آ گئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس مطلق العنان بادشاہ کو انتہائی معقول دلیل پیش کرتے ہوئے فرمایا:

﴿فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ﴾ (البقرة: ۲۵۸)

”بے شک اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو ذرا اسے مغرب سے نکال لا۔“

اس پر نمرود جو کفر و شرک کی انتہا پر پہنچا ہوا تھا، حیران، ششدر اور مبہوت (dumbfounded) ہو کر رہ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس صورت حال کو ان الفاظ میں بیان فرمایا:

﴿فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ﴾ (البقرة: ۲۵۸)

”پس وہ منکر حق ششدر ہو کر رہ گیا۔“

اس حوار سے یہ پتا چلتا ہے کہ داعی حق کو ہمیشہ اور ہر وقت مخالفین کے اعتراضات اور ان کے ذہنی الجھنوں کا جواب دینے کے لیے تیار رہنا چاہیے اور داعی کا جواب ایسا ہونا چاہیے جو ان کے ذہن و عقل کو پوری طرح سے جھنجھوڑ سکے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمرد کے ساتھ یہ مکالمہ اللہ تعالیٰ کے مالک الملک ہونے اور اس کی وحدانیت پر مبنی ہے۔ اس مکالمے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان دلائل سے نمرد اور نمردی ذہنیت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ مکالمے یا بحث و مباحثے کے میز پر اہل باطل اور غلط افکار و نظریات ہمیشہ ریت کی طرح ڈھیر ہو جاتے ہیں جیسا کہ مذکورہ مکالمے میں ہوا ہے۔

آج کے سائنسی دور میں ملحدین اور ہر بات اور دلیل کو عقل کی بنیاد پر پرکھنے والوں سے یہ کہنا آسان بات نہیں ہے کہ اللہ نے فلاں اور فلاں بات کہی ہے اور وہ مان جائیں گے بلکہ قرآنی دلائل کو پیش کرنے کے ضمن میں سائنسی حقائق و مشاہدے کو بھی اختیار کیا جائے گا۔ بقول پروفیسر محمد اکرام:

”سائنسی امکان اور عقل کی بنیاد پر اگر خدا کے وجود کے لیے فطرت کے مشاہدے پر زور دیا جائے تو شاید ہمیں کامیابی حاصل ہو جیسا کہ مکی عہد نبوت میں رسول اللہ ﷺ نے اہل مکہ کو عقل اور مشاہدہ فطرت کی بنیاد پر اسلام کی طرف متوجہ کیا تھا۔“ (۱۱)

اس سے ملتی جلتی بات ڈاکٹر مراد ہاف مین نے بھی لکھی ہے کہ:

”آپ کو قرآن پاک کی آیتیں پیش کرتے وقت سائنسی اسلوب کو بھی اختیار کرنا ہوگا۔ مثلاً اگر آپ کہیں گے کہ اللہ نے یہ فرمایا تو آپ کو ثبوت کے طور پر سائنسی حقائق کو پیش کرنا پڑے گا۔ اس طریقے سے اللہ کی آیات پر ایمان لانے کی راہ ہموار ہو جائے گی۔“ (۱۲)

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان حوار

قرآن مجید میں سب سے زیادہ تذکرہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ۱۳۶ بار آیا ہے۔ حضرت موسیٰ کے فرعون کے ساتھ متعدد مکالمے ہوئے ہیں جن میں نہ صرف حق اور باطل کے درمیان کش مکش کی بے مثال داستان مضمّن ہے بلکہ داعیان حق کے لیے بڑی عمدہ رہنمائی موجود ہے۔ حضرت موسیٰ کو بنی اسرائیل کی طرف بھیجا گیا جن کو فرعون نے پتھر استبداد میں جکڑ رکھا تھا۔ فرعون کا اس سے بھی بڑا جرم یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو مختار کل سمجھتا تھا اور اس نے دعویٰ کیا تھا کہ:

﴿أَنَا رَبُّكُمْ الْأَعْلَىٰ ۖ﴾ (النازعات)

”میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔“

فرعون زمین میں ہر طرف سرکشی کرنے کے ساتھ ساتھ خوف و دہشت اور فساد پھیلایا کرتا تھا اور ایک نجومی کے کہنے پر کہ مستقبل میں بنی اسرائیل کا ایک فرد (لڑکا) تمہارا اقتدار ختم کرے گا، اس نے ان کے بچوں کو قتل کرنے کا حکم دے رکھا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو فرعون تک پیغام حق پہنچانے کا کام سپرد کیا، کیوں کہ فرعون فسادی اور سرکش

ہو گیا تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهُ طَغٰی﴾ (طہ)

”اب تم فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہو گیا ہے۔“

حضرت موسیٰ نے حضرت ہارون کو معاون کے طور پر اپنے ساتھ لیا، جب یہ دونوں فرعون کے دربار میں پہنچے تو دربار میں فرعون کے بڑے بڑے مشیر سردار اور سرکردہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ فرعون نے ان دونوں کے آتے ہی یہ کہا: ﴿فَمَنْ رَّبُّكُمَا يُمُوسٰی﴾ (طہ) ”اے موسیٰ! تم دونوں کا رب کون ہے؟“ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رب کا تعارف کراتے ہوئے انتہائی بلیغ انداز میں جواب دیا:

﴿رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ حَلْقَهُ ثُمَّ هَدٰی﴾ (طہ)

”ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو ساخت بخشی پھر اس کو راستہ بتایا۔“

اس مکالمے میں فرعون نے ایک ایسا سوال بھی داغ دیا جس کے ذریعے وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتا تھا۔ ایک یہ کہ وہ درباریوں کو دکھانا چاہتا تھا کہ دیکھو موسیٰ کس طرح ڈھٹائی کے ساتھ ہمارے آباء و اجداد کو گمراہ کہتے ہیں، کیونکہ اس کو لگتا تھا کہ موسیٰ ان کو ضرور گمراہ گردانے گا۔ اس سوال کا مقصد یہ تھا کہ میں جو کچھ کہتا ہوں وہی صحیح اور برحق ہے۔ فرعون کا سوال یہ تھا:

﴿فَمَا بَالُ الْقُرُونِ الْاُولٰٓئِیْ﴾ (طہ)

”اچھا پھر ان قوموں کا کیا معاملہ ہوا جو پہلے گزر چکی ہیں؟“

یعنی مجھ سے پہلے جو قومیں گزر چکی ہیں وہ نہ تو انبیائے کرام پر ایمان لائیں اور نہ تو حید کی قائل تھیں، پھر ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی عذاب نازل نہیں ہوا۔ وہ تو حید اور آخرت کے انکار کے باوجود زندہ رہنے کے ساتھ ساتھ ایمان والوں پر ظلم و زیادتی کرتی رہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس موقع پر نہ صرف فرعون کے عزائم کو بھانپ لیا بلکہ انتہائی فہم و تدبیر اور حکمت بالغہ سے جواب دیا:

﴿قَالَ عَلِمَهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ کِتٰبٍ لَا یُضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسٰی﴾ (طہ)

”موسیٰ نے کہا: اس کا علم میرے رب کے پاس ایک نوشتے میں محفوظ ہے، میرا رب نہ چوکتا ہے اور نہ

بھولتا ہے۔“

سید مودودیؒ کے مطابق فرعون کے اس سوال کا مقصد سامعین اور ان کے توسط سے پوری قوم کے دلوں میں تعصب کی آگ بھڑکانا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جواب نے اس کے سارے زہریلے دانت توڑ دیے کہ وہ لوگ جیسا کچھ بھی تھے اپنا کام کر کے خدا کے ہاں جا چکے ہیں اور ان کی ایک ایک حرکت خدا جانتا ہے۔ (۱۳)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ حکیمانہ گفتگو جو فرعون کے ساتھ ہوئی، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر مبنی ہے۔ اس میں ہمارے لیے بہت سے اسباق موجود ہیں۔ جیسے ایک مطلق العنان حکمران، طاقت ور ملحد اور اپنے آپ کو اعلیٰ و برتر سمجھنے والے شخص سے کیسے گفتگو کی جائے اور کس طرح سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو راہ حق کی طرف دعوت

دینے کے لیے بہترین اور شاندار اسلوب اپنایا۔

ملحد اور موحّد شخص کے درمیان حوار

قرآن مجید میں ملحد اور موحّد شخص کے درمیان جو بحث و مباحثہ ہوا اس کو اللہ تعالیٰ نے عبرت کے لیے بیان کیا۔ ملحد اور موحّد (کافر اور مؤمن) کے مابین جو مناظرانہ گفتگو ہوئی ان میں سے ایک مادہ پرست تھا جب کہ دوسرا خدا اور آخرت پرست۔ ملحد شخص کو اللہ تعالیٰ نے انکور کے دو باغ دیے۔ یہ دونوں باغ ایسے شاندار تھے کہ ان کے ارد گرد کھجور کے درختوں کا پورا احاطہ تھا اور ان کے بیچ میں زمین کی کھیتی تھی۔ ان دونوں باغوں کے بیچ میں اللہ تعالیٰ نے نہر بھی جاری کر دی تھی، غرض کہ آب پاشی کا نہایت ہی اعلیٰ انتظام تھا۔ یہ دونوں باغ پھلوں سے خوب لد گئے اور پیداوار میں کسی بھی طرح کی کمی نہ ہوئی۔ اس ملحد شخص کی سب سے بڑی فکری خرابی یہ تھی کہ وہ ان باغوں کو اپنی ملکیت سمجھتا تھا اور یہ اپنے ہمسایہ (مؤمن) سے جو مال و دولت سے محروم تو تھا لیکن ایمان و یقین کی دولت سے مالا مال تھا، اترا کر کہتا ہے کہ میں تم سے مال و دولت اور حیثیت و اقتدار میں زیادہ اور طاقت ور ہوں۔ موحّد شخص نے اس کو اس احقنا نہ روش سے باز رہنے کی بھرپور کوشش کی اور اس کو مال و دولت کی بے ثباتی سے نہ صرف آگاہ کیا بلکہ اللہ کا شکر گزار بندہ بننے کی دعوت بھی دی۔ ایک دن ملحد نے اپنے ہمسائے سے (جسے یہ خوشحالیوں اور سہولتیں میسر نہ تھیں) بات کرتے ہوئے انتہائی تکبرانہ انداز میں کہا:

﴿أَنَا أَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَأَعَزُّ نَفَرًا ۝﴾ (الکہف)

”میں تجھ سے زیادہ مالدار ہوں اور تجھ سے زیادہ طاقت ور نفری رکھتا ہوں۔“

یہ باہم گفتگو جاری تھی کہ موحّد نے انتہائی بہترین اور شاندار اسلوب میں اس متکبر اور مادہ پرست شخص کو جواب دیتے ہوئے کہا:

﴿اَكْفَرْتُ بِاللّٰهِ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰكَ رَجُلًا ۝﴾ (الکہف)

”کیا تو کفر کرتا ہے اُس ذات کا جس نے تجھے مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا کیا اور تجھے ایک بڑا آدمی بنا کر کھڑا کیا!“

ابن کثیر نے اس آیت کی روشنی میں لکھا ہے:

اجابة صاحبة المؤمن واعظاله و زاجرا مما هو فيه من الكفر بالله و الاغتراء (۱۳)

یعنی مؤمن و موحّد شخص نے اس کو جواب دیا وعظ و تنبیہ کرتے ہوئے اس کفر و سرکشی پر جو اس ملحد میں تھا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حق اور باطل یا خدا پرستی اور دنیا پرستی کے درمیان زبردست کش مکش ہر وقت ہوتی رہتی ہے۔ اس کش مکش میں حق پرست غالب رہتا ہے بشرطیکہ وہ قرآنی اصولوں کو بروئے کار لائے۔ موحّد شخص کی اس گفتگو سے داعی کو یہ بھی سیکھنا کو ملتا ہے کہ باطل پرست یا مادہ پرست ذہنیت کو کس طرح سے خطاب کرنا چاہیے اور کس طرح سے بصیرت اور فہم و تدبر کے ساتھ خدائے ذوالجلال کے منکروں سے دلکش اور پراثر طرز گفتگو اختیار کرنا چاہیے۔

فلسفے کی مذہبی ضرورت

محمد رشید ارشد ☆

Abstract. What is the relation between Philosophy and Religion? There are several answers to this question. It has been thought that philosophy has a negative relation with religion. Study of philosophy was usually thought as counterproductive to the religious faith. People who indulge in the study of philosophical discourse usually start doubting their religious convictions. Bertrand Russell thought that philosophy is a no man's land between theology and science. As Bacon put it "a little philosophy inclineth a man's mind to atheism, but depth in philosophy bringeth men's minds about to religion." This article will try to bring forth the thesis that an in-depth study of philosophy can have a positive effect on the religious self of a believer.

Key Words: Philosophy, Religion, Theology, Science, Mind

فلسفہ کیا ہے؟ اس سوال کا جواب مختلف انداز سے دیا گیا ہے۔ سقراط کے نزدیک یہ موت کی تیاری کا عمل ہے۔^(۱) افلاطون کی رائے میں فلسفہ چیزوں کی تحدید و تعریف کا نام ہے۔^(۲) کلاسیکی روایت میں فلسفہ اصلاً مابعد الطبیعیات کا نام تھا۔ سب سے اہم سوال یہی تھا کہ وجود اپنی اصالت اور مظاہر میں کیا ہے۔ ایمان کی اولین مخاطب عقل ہے۔ انسان کا اصل شرف یہ ہے کہ وہ عقل رکھتا ہے، جس کے بارے میں امام غزالی کا یہ کہنا ہے کہ عقل ایک ایسا حاکم ہے جس کو نہ کوئی معزول کر سکتا ہے اور نہ اس کو تبدیل کیا جاسکتا ہے۔^(۳) خود نفسِ ایمان اصطلاح میں مابعد الطبیعی ہے۔ ایمان نام ہی ہے الغیب پر یقین کا۔^(۴) لہذا اس کے اولین یا واحد مخاطب، یعنی عقل کے اندر مابعد الطبیعی حقائق اور امور کی قبولیت اور اثبات کا مادہ ایک تو خلقی ہونا چاہیے اور دوسرے یہ کہ اس مادہ عقل کی بنیاد پر عقل کے ارادی استعمال سے کچھ ایسے نتائج ضرور اس کے کریڈٹ میں ہونے چاہئیں جو اس دعوے کو محتاجِ دلیل نہ رہنے دیتے ہوں کہ عقل مابعد الطبیعیات (metaphysicality) سے ایک خلقی مناسبت بھی رکھتی ہے اور اسے اپنے تخیلات، تصورات اور افکار کی تشکیل میں استعمال بھی کرتی ہے۔ اسی بات کو فلسفیانہ تناظر میں بیان کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ عقل اپنے معروض (object) سے تین طرح کا تعلق لازم رکھتی ہے:

☆ لیکچرر شعبہ فلسفہ، جامعہ پنجاب لاہور۔ پاکستان

پہلا تو یہ کہ یہ اسے ایک ادراک کل کا حصہ بناتی ہے۔ دوسرا یہ کہ اس کی تجرید کرتی ہے اور تیسرا یہ کہ اس معروض کے ساتھ اپنی ماورائیت اور غیریت کو برقرار رکھتی ہے۔ یہ تینوں مناجت عقل، عقل کے بارے میں اس بات کو یقین سے کہنا ممکن بنا دیتے ہیں کہ اس کی تمام فعلیت ایک مابعد الطبعی اساس رکھتی ہے، جس کی مستقل کارفرمائی کی وجہ سے عقل، معقولات کو اشیاء کی حیثیت سے اپنے باہر نہیں بلکہ تصور وغیرہ کی سطح پر اپنے اندر تشکیل دیتی ہے۔ اپنے معروضات سے ماورائیت (transcendence) کا یہ مستقل مزاج اتنا باور کروانے کے لیے کافی ہے کہ عقل، اپنی لائق ادراک ساخت میں بھی ایک ایسا مابعد الطبعی پن رکھتی ہے جس کا مصداق میسر نہ آئے تو بھی وہ تعقل کے تمام دائروں میں مرکزی حیثیت سے اپنا موثر کردار ادا کرتا رہتا ہے۔ عقل کو بدل کر اگر ذہن کی اصطلاح استعمال کی جائے تو بھی پوری بات یہی رہتی ہے کہ ذہن علم کو مسلمات میں ڈھالنے کی جو ایک مستقل اور مطلق خواہش رکھتا ہے، وہی اس کا جوہر ہے۔

دوسری طرف محسوسات ذہن کے لیے کبھی مسلمات نہیں بن پاتے، کیونکہ ان کی صورت میں استقلال تو ہو سکتا ہے لیکن معنی میں نہیں۔ یعنی صورت کے ساتھ معنی بھی اگر مستقل نہ ہو جائیں تو ذہن اپنے معلومات کو مسلمات کا درجہ نہیں دیتا۔ اسی لیے حسی اور تجربی علوم ذہن کے اندر تسلیم کی ایسی فضا نہیں پیدا کرتے جس کی بدولت یہ کسی خاص رخ پر اپنی تفیشی حرکت کو روک لے اور کسی خاص معاملے میں سوال کی حالت سے نکل آئے۔ ذہن کی یہ مطلوبہ حالت تسلیم علم کے مقابلے میں ایمان سے زیادہ سازگاری رکھتی ہے اور شہود کی نسبت غیب سے زیادہ مناسبت۔ ذہن کا یہ مادہ جو ایمان کو مفید شعور اور موجب علم بنالیتا ہے اگر ذہن کو درکار آزادی اور مقصدیت کے ساتھ اپنی نشوونما کے عارضی اور مستقل مراحل سے گزرتا ہے تو ایمانیات بھی شعور کے وسعت پذیر دائروں میں اپنی حتمی مرکزیت نہ صرف یہ کہ برقرار رکھ سکتے ہیں بلکہ یہ شعور کی متنوع فعلیتوں کی مستقل اور transcendental اساس بھی بن سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ایمان کا main character یعنی خدا، معلوم ہونے اور موجود ہونے کی ذہنی اور خارجی کلیتوں کو اپنے اقرار میں، شعور کے لیے موجب تسکین اقرار میں، ایک کر دیتا ہے۔

یہاں اقرار کا ذکر اس لیے کیا کہ ایک تو خود ایمان اقرار ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ شعور انکار کو محفوظ نہیں رکھتا، کسی چیز کا اقرار کر کے ہی اپنے موقف کی تعمیر کرتا ہے۔ انکار شعور کا فعل تو ہے حال نہیں، ورنہ شعور ایک خلا میں بدل کر رہ جائے۔ اس کا ہر انکار یا تو کسی اقرار کی بنیاد پر ہوتا ہے یا اس اقرار کی تکمیل کے لیے ہوتا ہے۔ شعور کی اس بناوٹ کا، یعنی مبنی بر اقرار بناوٹ کا تجزیہ یہ بتاتا ہے کہ اس کے لیے سب سے بڑا مسئلہ بلکہ مقصود واحد یہ ہے کہ اسے وہ حال حاصل ہو جائے جہاں ذہنی اور خارجی یا زیادہ واضح لفظوں میں، وجود اور شعور کی دوئی ختم ہو جائے۔ اس کے لیے یہ کوئی ایسا کلی مفروضہ یا تصور ڈھونڈنے اور تشکیل دینے میں لگا رہتا ہے جس میں پہنچ کر وجود اور علم ایک ایسی اکائی میں ڈھل جائیں کہ ایک کا نام دوسرے پر صادق آ سکے۔ یہ شعور کی ایمانی ساخت ہے اور یہ مطالبہ شعور کی ایمانی ساخت کے بغیر پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ خدا کو مان لینا اسی اقتضا کی حتمی تسکین اور تکمیل کر دیتا ہے۔ ذہن کے پاس خدا کے سوا کوئی ایسا وحدت ساز تصور موجود نہیں ہے جو معلوم اور موجود کی حقیقی عینیت کا نہ صرف یہ کہ احاطہ کر لے بلکہ وجود اور شعور کی اطلاقی کثرت کو ہم اصل بنا دے۔

یہی وجہ ہے کہ علم کا کل اپنے مابعد الطبعی جوہر پر استواری کی حالت میں جتنا بڑھتا جائے گا اتنا ہی ایمان کے محتوا (content) یعنی وجود کے کل کے ساتھ اس کی موافقت ترقی کرتے کرتے ایک ایسی عینیت تک پہنچ جائے گا جہاں ذہن موضوع و معروض کی دوئی (subject-object duality) کو خارجی اقلیم میں برقرار رکھتا ہے، لیکن داخلی اقلیم میں یہ دوئی حاضری الادراک نہیں رہتی۔ ویسے بھی ذہن اور اس کے معروض میں 'اور' سے تعبیر کیا جاسکے والا فاصلہ وجودی اصطلاح میں کبھی ختم نہیں ہوتا، البتہ علم کے حتمی تناظر میں اس کا استحضار نہیں رہتا۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ذہن میں حقائق کے عنوان سے ایک ایسی سطح رونما ہو جاتی ہے جس کے تجربے سے علم تصور اور تصدیق کی معروف correspondence سے نکل جاتا ہے اور اسے ان دونوں میں امتیاز کی حاجت نہیں رہتی۔ یہ یقین کا آخری درجہ ہے جس کے حصول کی بدولت وجود کی مابعد الطبیعیات یا مطلق ماورائیت ذہن میں محصور ہو جانے کا تاثر اور تصور پیدا کیے بغیر خود ذہن کے لیے انتہائی مرتبے پر حقیقی ہو جاتی ہے۔ یہی ذہن کا وہ انفعال ہے جس کے عمل میں آئے بغیر ذہن کو ادراک، تخیل وغیرہ کا بنیادی مادہ میسر نہیں آسکتا۔ ایمان کی علمی تشکیلات جو ناگزیر ہیں، ان کے process کو سمجھنے کے لیے علم کی اس تعریف کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے، جس کے مطابق علم اپنی تعمیلی صورت اور حالت میں موضوع اور معروض دونوں کی خودورائی (self transcendence) کے شعور میں آ جانے کا نام ہے۔ یعنی شے اپنے رسمی (formal) وجودی حدود اور ذہن اپنے معمول کے ادراک کی قیود سے وراثت حاصل کیے بغیر علم کے اتمام و کمال یعنی مذہبی اصطلاح میں یقین اور علمانی اصطلاح میں اس مستقل تناظر تک نہیں پہنچ سکتا جس تک رسائی ہوئے بغیر جانے کا عمل ماننے پر منتج نہیں ہوتا۔ ایمان اپنی ساخت ہی میں جانے اور ماننے کی ایسی اکائی کا نام ہے جس میں پہلا عنصر مغلوب رہتا ہے اور دوسرا غالب۔ یہی ہر طرح کے علم کا بنیادی حال ہے۔ ہر طرح کے علم سے مراد حقیقت کو اپنا ہدف بنانے والے علوم ہیں۔

شعور کی مابعد الطبیعیات سے مناسبت کا بڑا اظہار چونکہ فلسفے میں ہوا ہے لہذا فلسفے کو نہ مانتے ہوئے بھی اسے جاننا ذہن کی ایمانی استعداد کو بڑھا سکتا ہے۔ دینی ذہن کا فلسفے سے جو بھی مفاد ہے وہ بہت بنیادی ہوتے ہوئے بھی بس اتنا ہے کہ مابعد الطبعی امور سے مناسبت رکھنے والے ذہن کو ایمان کی تکمیل کے لیے درکار صلاحیت تصور بھی حاصل ہو جائے اور قوت تصدیق بھی۔ ایمانی شعور کو فلسفیانہ نتائج اور نظریات سے کچھ نہیں لینا ہوتا، لیکن فلسفیانہ صلاحیت کا فقدان یا اس سے بے خبری کی بنیاد پر وجود میں آنے والی بے نیازی اس کے لیے کچھ پہلوؤں سے مضرب ہو سکتی ہے۔ ان میں سے سب سے بڑا پہلو وہی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے کہ 'الغیب' سے وہ مناسبت نصیب نہیں ہوتی جو ذہن کو اس کی فعلیت اور انفعال دونوں کے ساتھ ایمان سے متعلق رکھتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ 'الغیب' اگر ذہن کے لیے بھی موجب تسکین نہ ہو تو ایمان کے کئی مطالبات جو ذہنی بھی ہو سکتے ہیں اور عملی بھی، پورے نہیں ہو سکتے۔

یہ دیکھنا بھی مفید ہوگا کہ ایمان ایک بہت مرکزی جہت سے اُمّ الشعور کی حیثیت رکھتا ہے، جس سے شعور کی تمام انواع کی کفالت ہوتی ہے یا ہونی چاہیے۔ مجموعی شعور میں اپنی مستقل faculties کے درمیان ایک وحدت خیز تعلق کا جو نظام چل رہا ہے اگر ایمانی ذہن اس سارے نظام اور mechanism کو تصرف میں نہیں لاتا تو پھر ایمان کا اُمّ الشعور ہونا خود اس سے اوجھل رہ جائے گا، اور یہ مجموعی شعور کے ساتھ ساتھ خود ایمانی شعور کے لیے

بھی نقص کی بات ہوگی۔ قدیم سے آج تک مجموعی شعور کے mechanics اور اس کے تالیفی دروست کی تحقیق کا جو بھی کام ہوا ہے اس میں فلسفہ کا حصہ دیگر علوم سے زیادہ ہے۔ تو ان معنوں میں بھی فلسفہ سے بنیادی آگاہی ضروری ہے تاکہ ایمان کا بڑا مقصود یعنی شعور پر اس کی حاکمیت نظر انداز نہ ہو جائے۔ فلسفہ کی صحت یقیناً جزوی عارضی اور مشتبہ ہے، تاہم ایک ذہنی صلاحیت کے طور پر اس پر دسترس ہونا اس لیے بھی تقریباً ناگزیر ہے کہ اس کی مدد سے ایمانیات ذہن کے لیے اجنبی اور علم کے دائرے سے لاتعلقی نہیں رہتے۔

ایک اور پہلو سے بھی فلسفہ ذہن کی ایک بنیادی استعداد کو بیدار کرنے میں بڑا کردار رکھتا ہے۔ ہائیڈیگر کے بقول زبان وجود کا گھر ہے۔^(۵) ذہن کی ایک خاص قوت معنی کو صورت سے آزاد رکھنے یا کروانے میں صرف ہوتی ہے۔ اس کی ذرا سی تفصیل یہ ہے کہ ذہن معانی کا گھر ہے، وہ معانی جو صورت سے حاصل ہو کر بھی صورت سے زیادہ کامل ہوتے ہیں۔ ویسے معنی کی تعریف ہی یہ ہے کہ ادراک میں آ کر شے خود اپنے اظہار کے حدود و قیود کو توڑ دیتی ہے۔ معلوم شے صورت کے قوانین کے ساتھ موجود شے سے زیادہ مکمل ہوتی ہے۔ اس بنیاد پر ذہن اپنے معروضات سے ایک ایسا تعلق رکھتا ہے جس میں وہ شے سے موافقت کو ملحوظ رکھتا ہے لیکن اس میں محدود نہیں رہتا۔ شے کو اپنا موضوع بنا کر اور اس کے صحیح ادراک کو حاصل کرنے کا قصد کر کے بھی ذہن شے کے ساتھ برائیت کی ایک فعال نسبت ضرور رکھتا ہے اور اسی نسبت کی بدولت معنی وجود میں آتے ہیں۔ یہ صورت اور معنی کا وہ تعاملی نظام (Interactive Process) ہے جو ذہن کی فطرت میں داخل ہے اور انسان کے پیدا کیے ہوئے تمام علوم میں سے ایک فلسفہ ہی ہے جو اس نظام کو غیر شعوری نہیں رہنے دیتا بلکہ ادراک اور تصرف میں لے آتا ہے۔ فلسفہ کی بیشتر روایتوں میں ایک مزاج علم مشترک ہے اور وہ ہے علامتیت (Symbolism) کا مزاج۔ علامتیت (Symbolism) سے حتمی مراد یہ ہے کہ شے اپنے مراتب ہستی کو اور اپنے حقائق وجود کو خود سے منکشف نہیں کرتی بلکہ یہ ذہن ہے جو شے پر عمل کر کے ان مراتب و مدارج کا انکشاف کرتا ہے۔ یہ انکشاف اپنی clinical ساخت میں ظاہر ہے کہ تصور ہی ہے لیکن یہ تصور ایسا ہے جو تصدیق سے متعلق مگر اس پر حاکم ہوتا ہے۔ علامت (symbol) یہی ہے۔ شے سے متعلق اور اس پر حاکم۔ اس علامتیت (Symbolism) سے مانوس ہو کر شعور میں جو فضا پیدا ہوتی ہے وہ سب سے زیادہ ایمانیات کے لیے سازگار ہے۔ یعنی سارا کارخانہ شہود اپنے تمام تر علمی و عینی پھیلاؤ کے ساتھ غیب پر دلالت کرتا ہے، وہ غیب جو علم اور وجود دونوں کی اصل ہے اور جس کا محل ذہن اور شے کے جبری تعلق سے مطلقاً ماورا ہوتے ہوئے بھی اگر کہیں ہے تو وہ ذہن ہے، شے مشہود نہیں۔ فلسفہ کی اصطلاح میں علامت (symbol) کا جو ہر یا مبدا و مرجع حقیقت ہے۔ فلسفیانہ ذہن اس حقیقت کو تجرید، تخیل، تعقل وغیرہ کی مدد سے مجمل لائق ادراک اور مفصلاً قابل اثبات بناتا ہے۔ اگر فلسفہ کے طریقہ کار تک رہا جائے اور اس کے مقاصد سے صرف نظر کر لیا جائے تو حقیقت اور ذہن یا عقل کے تعلق کی دریافت کے لیے کی جانے والی تمام ذہنی کاوشیں ایمان سے مانوس کر دینے والی ایک نتیجہ خیز قوت میں ڈھل سکتی ہیں۔ جس ذہن میں معنی کی تعمیر کا عمل اس سطح پر نہ ہو رہا ہو جو اوپر بیان ہوئی ہے تو وہ ذہن ایمانیات کا خود اپنے لیے قابل اعتبار مخاطب یا حامل نہیں بن سکتا۔ اس لحاظ سے بھی فلسفہ سے اصولی طور پر باخبر رہنا ایمانی ذہن کے لیے مفید ہے۔ البتہ یہ خیال رہے کہ

ایمان محض ذہنی construct نہیں ہے اس کی تقویت اور تکمیل کا سارا عمل عقلی اور ذہنی نہیں ہے، لیکن اگر مقصود یہ ہے کہ ذہن کو ایمان کا ظرف بنایا جائے تو پھر اوپر ذکر کی گئی چیزیں جواز اور افادیت رکھتی ہیں۔ اس سے بڑھ کر کوئی ایسا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا جس سے یہ تاثر ملتا ہو کہ فلسفہ دانی خود ایمان کی ضرورت ہے۔

فلسفے نے کم از کم دو ایسے علوم پیدا کیے ہیں جنہیں نظر انداز کر کے ایمان پر استدلال کرنے والا علم کلام وجود ہی میں نہیں آسکتا، اور وہ دو علوم ریاضی اور منطق ہیں۔ ریاضی سے حقیقت کا موجود فی الخارج ہونا ثابت ہو سکتا ہے اور منطق سے اس کا موجود فی الذہن ہونا۔ اس کی کچھ تفصیل یہ ہے کہ ریاضی نے لامتناہی (infinite) کو موجب ادراک بنا دیا۔ ریاضی نے لامتناہی کو soul of all definitions کے طور پر منوالیا ہے۔ اس بنیاد پر ریاضی میں دیگر انسانی علوم کے مقابلے میں اثبات وجود باری کی استعداد زیادہ پائی جاتی ہے۔ خارج کا تحقق ہی اگر غیر متناہی کے اثبات سے مشروط ہو جائے تو اس سے خدا کے موجود ہونے پر ایمان لانا عقل کے لیے بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ جہاں تک منطق کا تعلق ہے تو منطق کلیات کو منج علم بنانے سے عبارت ہے۔ کلی کی ذہن میں وہی حیثیت ہے جو لامتناہی کی خارج میں ہے۔ کلیات کو مقوم وجود اور معارف شے مان لینے سے اور اسے علم کی تشکیل میں لازم ٹھہرا لینے سے منطق میں حق اور شعور کے تعلق کی ایک فطری عقلی بنیاد حاصل ہو جاتی ہے۔ یعنی کلیات جو categories of knowledge and being دونوں ہیں اگر نظام شعور و وجود میں اول و آخر کی حیثیت اختیار کر لیں تو ذہن ایمان بالغیب سے بدیہی مناسبت پیدا کر لیتا ہے یا کر سکتا ہے۔ گویا اثبات حق کی تصدیقی ضرورت ریاضی سے پوری ہو سکتی ہے اور تصوری لوازم منطق سے فراہم ہو سکتے ہیں بشرطیکہ نفس حق ان کا اپنا تصور اور مفروضہ نہ ہو بلکہ وحی سے پہنچا ہو۔

حقیقت کا موجود فی الخارج اور موجود فی الذہن ہونا ایمانی مقاصد کے ساتھ حق کی تصدیقات کے ذہنی اور خارجی locales یہی ہیں۔ بہت آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خدا کو باعتبار تنزیہ و تشبیہ اور بلحاظ انفس و آفاق جاننے اور ماننے کے ایمانی مقاصد میں ریاضی اور منطق پر تبحر کتنا مددگار ہو سکتا ہے! تاہم یہ خیال رہے کہ فلسفے سے حاصل ہونے والا علم ذہن کے ایمانی structures کو منہدم کر سکتا ہے اس سے علم کا مفاد نہیں رکھا جاسکتا، البتہ اسے استعداد علم میں اضافے کا ذریعہ ضرور بنایا جاسکتا ہے۔ یہاں یہ بات دہرا دینا غیر مناسب نہ ہوگا کہ فلسفہ ذہن میں غیب کی قبولیت کو ابھارتا ہے، لیکن خود غیب کیا ہے؟ اس کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ یہ معرفت وحی سے میسر آتی ہے جو ذہن میں ایمان کو علم پر حاوی رکھنے کا واحد وسیلہ ہے۔

حواشی:

(۱) دیکھئے: Plato, Phaedo, The Dialogues of Plato. New York: Bentham Books, 2006

(۲) دیکھئے: Plato, Apology, The Dialogues of Plato. New York: Bentham Books, 2006

(۳) دیکھئے المستصفی، ابو حامد غزالی، بیروت: دار الکتب العلمیۃ، ۲۰۰۰ء ص ۳۔

(۴) دیکھئے: القرآن: البقرة ۲:۳

(۵) دیکھئے: Martin Heidegger, Letter on Humanism, Basic Writings. London:

Harper Perennial, 2008.



اسلام میں عورت کا مقام (اور میاں بیوی کے باہمی معاملات) (۲)

پروفیسر حافظ قاسم رضوان *

معاملات طلاق اور طلاق احسن

اس ضمن میں درج ذیل آیات کو سمجھئے:

﴿الطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ ۖ فَاِمْسَاكُ بِمَعْرُوفٍ اَوْ تَسْرِيْعٌ بِاِحْسَانٍ ۚ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّا اَتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّا اَنْ يَّخَافَا اَلَّا يَقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۚ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ۚ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ ﴿۳۸﴾﴾ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْۢ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ۚ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَنْ يَتَرَاجَعَا اِنْ ظَنَّا اَنْ يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۚ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يَبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾﴾ (البقرة)

”طلاق دو مرتبہ ہے، پھر یا تو معروف طریقے سے روک لینا ہے یا پھر خوبصورتی کے ساتھ رخصت کر دینا ہے۔ اور تمہارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ جو کچھ تم نے انہیں دیا تھا اس میں سے کچھ بھی واپس لو سوائے اس کے کہ دونوں کو اندیشہ ہو کہ وہ حدود اللہ کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ پس اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ وہ دونوں حدود الہی پر قائم نہیں رہ سکتے، تو ان دونوں پر اس معاملے میں کوئی گناہ نہیں ہے جو عورت فدیہ میں دے۔ یہ اللہ کی حدود ہیں، پس ان سے تجاوز مت کرو اور جو لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں وہی ظالم ہیں۔ پھر اگر وہ (تیسری مرتبہ) اسے طلاق دے دے تو وہ عورت اس کے بعد اس کے لیے جائز نہیں ہے جب تک کہ وہ عورت کسی اور شوہر سے نکاح نہ کرے۔ پس اگر وہ اس کو طلاق دے دے تو اب کوئی گناہ نہیں ہوگا ان دونوں پر کہ وہ مراجعت کر لیں اگر ان کو یہ یقین ہو کہ وہ اللہ کی حدود کی پاسداری کر سکیں گے۔ اور یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں، جن کو وہ واضح کر رہا ہے ان لوگوں کے لیے جو علم حاصل کرنا چاہیں۔“

قرآن پاک میں طلاق کا مفصل طریقہ موجود ہے، جس پر عمل پیرا نہ ہونے کی بنا پر ہم طرح طرح کے عائلی مسائل میں گھرے ہوئے ہیں۔ طلاق کے مسائل کو زیر غور لانے سے پہلے نکاح کی اہمائی حقیقت کا سمجھنا ضروری ہے۔

☆ ریٹائرڈ صدر شعبہ اسلامیات و مطالعہ پاکستان، گورنمنٹ کالج آف کامرس، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

نکاح کی ایک حیثیت تو فریقین کے درمیان باہمی معاملے اور معاہدے کی ہے، جیسے کہ بیع و شراء اور لین دین کے معاملات ہوتے ہیں۔ دوسری حیثیت ایک شرعی سنت اور عبادت کی ہے۔ اسی لیے انعقاد نکاح میں کچھ ایسی شرائط ضروری ہیں جو کہ بیع و شراء کے عام معاملات میں نہیں ہوتیں۔

پہلے یہ کہ ہر مرد کا ہر عورت سے نکاح نہیں ہو سکتا۔ اس ضمن میں شریعت کا ایک مستقل قانون ہے جس کے تحت بہت سی عورتوں اور مردوں کا باہمی نکاح ممکن نہیں۔ دوسرے تمام معاملات اور معاہدات کے مکمل ہونے کے لیے گواہی کی کوئی شرط نہیں۔ گواہی کی اس وقت ضرورت ہوتی ہے جبکہ فریقین میں اختلاف رونما ہو۔ اس کے برعکس نکاح کے منعقد ہونے کے لیے بھی گواہوں کا موقع پر موجود ہونا شرط ہے۔ اگر مرد اور عورت بغیر گواہوں کے باہمی نکاح کر لیں اور دونوں فریق کبھی اس کا انکار اور اس میں اختلاف بھی نہ کریں، پھر بھی شرعاً وہ نکاح باطل ہے جب تک گواہوں کے سامنے دونوں کا ایجاب و قبول نہ ہو۔^(۴۱)

مزید سنت یہ ہے کہ نکاح کو اعلان عام کے ساتھ کیا جائے۔ اسی طرح اور بہت سی شرائط و آداب ہیں جو کہ معاملہ نکاح کے لیے ضروری یا مسنون ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ و دیگر حضرات ائمہ کے نزدیک تو نکاح میں معاملہ اور معاہدہ کی حیثیت سے زیادہ عبادت اور سنت کا پہلو غالب ہے۔

نکاح کی حقیقت کے بعد اب طلاق کے عمل کو سمجھئے۔ طلاق کا حاصل نکاح کے معاہدے اور معاملے کو ختم کرنا ہے۔ شریعت میں نکاح کے معاملے کا ختم کرنا بھی عام لین دین کے معاملات کی طرح نہیں، کہ جب اور جس طرح چاہے اس معاملے کو ختم کر کے دوسرا معاملہ کر لیا جائے، بلکہ اس کے لیے بھی ایک حکیمانہ طریقہ کار اپنایا گیا ہے۔ اسلامی تعلیمات کا اصل رخ تو یہ ہے کہ نکاح کا معاملہ اور معاہدہ عمر بھر کے لیے ہو، اس کے توڑنے اور ختم کرنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ اس کے اختتام کا اثر صرف فریقین پر ہی نہیں، بلکہ نسل و اولاد کی تباہی اور بربادی تک ہو سکتا ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر بسا اوقات قبیلوں اور خاندانوں میں فتنہ و فساد کی بھی نوبت آ جاتی ہے۔ یوں پورا معاشرہ اس سے متاثر ہوتا ہے۔

اسی لیے جو وجوہات اور اسباب اس معاملے اور معاہدے کو توڑنے کا سبب بن سکتے ہیں، شریعت میں انہیں دور کرنے کا پورا انتظام کیا گیا ہے۔ ناچاقی اور نا موافقت کی صورت میں اول انہماق و تفہیم کی ہدایت، پھر زجر و تنبیہ کی اجازت دی گئی ہے۔ اس سے بھی صورت حال بہتر نہ ہو اور بات آگے بڑھ جائے تو طرفین کے خاندان کے چند اہل افراد کو ثالث بنا کر معاملہ حل کرنے کو کہا گیا ہے۔ اور پھر جب اصلاح احوال کی تمام کوششیں ناکام ہو جائیں اور باہمی اکٹھا رہنا عذاب بن جائے، تو ایسی صورت میں ازدواجی تعلق کا اختتام ہی بہتر ہے۔ اسلامی شریعت میں بعض دوسرے مذاہب کی طرح یہ بھی نہیں کہ رشتہ ازدواج ناقابلِ فسخ ہی رہے اور کسی حالت میں بھی نہ ٹوٹ سکتا ہو۔ یہاں طلاق اور فسخ نکاح کا باقاعدہ قانون ہے، جس کی پابندی لازم ہے۔ طلاق کا اختیار تو مرد کو دیا گیا ہے جس میں فکر و تدبیر اور تحمل کا مادہ عورت کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ عورت کے ہاتھ میں یہ

آزاد اختیار نہیں دیا گیا، لیکن اس کو بالکل محروم بھی نہیں رکھا گیا کہ وہ مرد کا ظلم و ستم سہنے پر ہی مجبور ہو۔ اس کا یہ حق ہے کہ حاکم شرعی (قاضی) کی عدالت میں اپنا معاملہ پیش کر کے اور زیادتی کا ثبوت دے کر اپنا نکاح فسخ (ختم) کر اسکے یا طلاق حاصل کر سکے۔

پھر مرد کو طلاق کا آزاد حق دے کر اول تو حدیث میں یہ ارشاد ہوا:

((أَبْغَضُ الْحَلَالِ إِلَى اللَّهِ تَعَالَى الطَّلَاقُ)) (۴۲)

”حلال چیزوں میں سب سے زیادہ مبغوض اور مکروہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک طلاق ہے۔“

اس فرمان سے طلاق کی کراہت واضح ہو گئی، صرف مجبوری میں اجازت ہے۔ دوسرے یہ پابندی کہ غیظ و غضب کی حالت اور وقتی یا ہنگامی ناگواری کی صورت میں یہ اختیار استعمال نہ کیا جائے۔ اسی حکمت کی بنا پر حالت حیض میں طلاق منع ہے اور اس حالت طہر میں بھی جس میں ہم بستری ہو چکی ہو ان دونوں کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے: ﴿فَطَلِّقُوهُنَّ لِعَدَّتِهِنَّ﴾ (الطلاق: ۱) یعنی طلاق دینا ہو تو ایسے وقت میں دوجس میں بلا وجہ عورت کی عدت طویل نہ ہو۔

حیض کی حالت میں طلاق ہونے کی صورت میں رائج قول کے مطابق موجودہ حیض عدت شمار نہ ہوگا، اس کے بعد طہر اور پھر اس کے بعد حیض سے عدت شمار ہوگی۔ اور ہم بستری والے طہر میں طلاق دینے کی صورت میں اگر حمل ٹھہر گیا تو وضع حمل تک عدت طویل ہو جائے گی۔ تیسرے یہ پابندی کہ معاہدہ نکاح توڑنے اور ختم کرنے کا وہ طریقہ نہیں جو کہ عام بیع و شراء کے معاملات اور معاہدات کا ہوتا ہے کہ ایک دفعہ معاہدہ ختم ہونے پر فوراً دونوں فریق آزاد ہو گئے اور معاملے کے حوالے سے اب ان پر کوئی پابندی باقی نہیں رہی کہ تیسرے فریق سے کوئی معاہدہ نہیں کر سکتے۔ اس کے برعکس معاہدہ نکاح ختم ہونے کی صورت میں پہلے تو اس کے تین درجے تین طلاقوں کی صورت میں رکھے گئے۔ پھر اس پر عدت کی پابندی لگادی گئی کہ اس کے پورا ہونے تک نکاح کے بہت سے اثرات باقی رہیں گے عورت کو دوسرا نکاح حلال نہ ہوگا اور مرد پر بھی کچھ پابندیاں باقی رہیں گی۔

چوتھی پابندی یہ ہے کہ اگر صاف و صریح لفظوں میں ایک یا دو طلاق دی گئی تو طلاق دیتے ہی نکاح نہیں ٹوٹتا، بلکہ یہ رشتہ ایک درجہ میں عدت پوری ہونے تک قائم رہتا ہے۔ دوران عدت اگر مرد اپنی طلاق رجعی سے رجوع کر لے تو سابقہ نکاح بحال ہو جائے گی۔ لیکن رجوع کا یہ اختیار صرف ایک یا دو طلاق تک محدود ہے تاکہ کوئی ظالم شوہر ایسا نہ کر پائے کہ بیوی کو ہمیشہ طلاق دیتا اور پھر رجوع کر کے اپنی قید میں رکھتا رہے۔ اسی لیے یہ حکم دیا گیا کہ اگر کسی نے تیسری طلاق بھی دے دی تو اب اس کا رجوع کرنے کا اختیار ختم ہو گیا۔ بلکہ فریقین باہمی رضامند ہو کر اب دوبارہ نکاح کرنا بھی چاہیں تو بغیر ایک مخصوص صورت کے دوبارہ نکاح بھی حلال نہیں ہے۔

آیت مذکورہ میں اسی نظام طلاق کے اہم احکامات کا ذکر ہے، اول تو ارشاد فرمایا:

﴿الطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ﴾ یعنی طلاق دو ہی مرتبہ ہے۔ ان دونوں مرتبہ کی طلاقوں میں یہ پک رکھ دی گئی ہے کہ

ان سے نکاح بالکل ختم نہیں ہوا۔ عدت کے پورا ہونے تک مرد کو اختیار ہے کہ رجوع کر کے بیوی کو اپنے نکاح میں روک لے یا پھر رجوع نہ کرے اور عدت پوری ہونے دے، عدت پوری ہونے پر نکاح کا تعلق بالکل ختم ہو جائے گا۔ اسی کو یوں ارشاد فرمایا گیا: ﴿فَإِمْسَاكَ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٍ بِإِحْسَانٍ﴾ یعنی یا تو شرعی طریقے کے مطابق رجعت کر کے بیوی کو اپنے نکاح میں روک لے یا پھر بہتر معاملہ کرتے ہوئے اس کی عدت پوری ہونے دے تاکہ وہ آزاد ہو جائے۔

تیسری طلاق سے پہلے درمیان میں ایک اور مسئلہ بیان فرمایا گیا جو کہ ایسے حالات میں عموماً زیر بحث آ جاتا ہے کہ بعض ظالم شوہر نہ تو بیوی کو رکھنا چاہتے ہیں، نہ اس کے حقوق کی فکر کرتے ہیں اور نہ ہی طلاق دیتے ہیں۔ بیوی تنگ ہوتی ہے تو اس کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر طلاق دینے کے لیے اس سے کچھ مال یا کم از کم مہر کی معافی یا واپسی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ قرآن نے اس کو بالکل حرام قرار دیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا﴾ یعنی تمہارے لیے حلال نہیں کہ طلاق کے معاوضہ میں ان سے اپنا دیا ہوا مال اور مہر وغیرہ واپس لے لو۔ البتہ ایک صورت اس سے مستثنیٰ فرمادی گئی۔ اگر عورت یہ محسوس کرے کہ وہ طبائع کے زیادہ اختلاف کی بنا پر شوہر کے حقوق ادا نہیں کر سکتی، تو پھر جائز ہے کہ وہ شوہر کے ادا کردہ مہر کی واپسی کے بدلے یا مہر غیر ادا شدہ ہو تو اسے معاف کر کے طلاق (خلع) حاصل کر لے، یہ طلاق بائناہ کے حکم میں ہے۔

یہ ضمنی مسئلہ بیان کرنے کے بعد تیسری طلاق کا ذکر پھر اس طرح ہوا: ﴿فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ﴾ یعنی اگر اس شخص نے تیسری طلاق بھی دے ڈالی (جو شرعاً غیر پسندیدہ ہے) تو اب نکاح کا معاملہ مکمل طور پر ختم ہو گیا اور اس کو رجعت کا بالکل اختیار نہیں رہا۔ چونکہ اس نے اس طرح سے شرعی حدود سے تجاوز کیا تو سزا کے طور پر میاں بیوی راضی بھی ہوں تو دوبارہ ہرگز نکاح نہیں کر سکتے۔ البتہ ایک شرط سے یہ جائز ہے کہ عورت (طلاق کی عدت پوری کر کے) کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے اور حقوق زوجیت ادا کر کے اس کے ساتھ رہے۔ پھر اتفاقاً وہ دوسرا شوہر بھی طلاق دے (یا مر جائے) تو عدت پوری کرنے کے بعد پہلے شوہر سے نکاح ہو سکتا ہے۔ آیت کے آخری حصے ﴿فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا﴾ کا یہی مفہوم ہے۔ احادیث صحیحہ سے واضح ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص طلاق ثلاثہ کے بعد اپنی بیوی کو محض اپنے لیے حلال کرنے کے لیے کسی سے منصوبہ بندی کر کے اس کا نکاح کرائے اور پھر پہلے سے طے شدہ طور پر اسے طلاق دلوائے، تو ایسا نکاح ظاہر تو نکاح ہے حقیقتاً بدکاری ہے۔ حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عقبہ بن عامرؓ کی متفقہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس طریقے سے حلالہ کرنے اور کروانے والے پر لعنت فرمائی ہے:

((لَعَنَ رَسُولُ اللَّهِ الْمُحِلَّ وَالْمُحَلَّلَ لَهُ)) (۴۳)

ایک دوسری حدیث میں اس طرح سے حلالہ کرنے والے شخص کو تینس مُسْتَعَار ’کرائے کے سائڈ‘ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ایک دفعہ حضور ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا: ((أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِتَيْنِسِ الْمُسْتَعَارِ)) ”کیا میں تمہیں کرائے کے سائڈ کے بارے میں نہ بتاؤں؟“ تو انہوں نے پوچھا: مَنْ هُوَ يَا رَسُولَ اللَّهِ ”اے اللہ کے رسول! وہ کون ہے؟“ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((هُوَ الْمُحْلِلُ، لَعَنَ اللَّهُ الْمُحْلِلَ وَالْمُحْلَلُ لَهُ)) (۴) ”وہ حلالہ کرنے والا ہے، حلالہ کرنے والے پر اللہ کی لعنت ہے اور جس کے لیے کیا جائے اس پر بھی لعنت“۔

اسلوب قرآن پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ طلاق کا صحیح شرعی طریقہ یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ الگ الگ دو طلاق دی جائیں، تیسری طلاق تک پہنچنا مناسب ہی نہیں۔

﴿الطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ﴾ کے بعد تیسری طلاق کو حرفِ ان کے ساتھ ﴿فَإِنْ طَلَّقَهَا﴾ فرمانے میں اس طرف اشارہ موجود ہے، ورنہ سیدھے طور پر ”الطَّلَاقُ ثَلَاثٌ“ کہا جاتا۔ اس کو چھوڑ کر دوسری تعبیر اختیار کرنے میں واضح اشارہ ہے کہ تیسری طلاق تک نہیں پہنچنا چاہیے۔ اس بنا پر امام مالکؒ اور بعض دوسرے فقہاء نے تیسری طلاق کی اجازت ہی نہیں دی، وہ اسے طلاقِ بدعت کہتے ہیں۔ دوسرے فقہاء نے تین طلاق کو اس شرط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے کہ الگ الگ طہروں میں تین طلاقیں دی جائیں۔ ان فقہاء کی اصطلاح میں اس کو بھی طلاقِ سنت سے تعبیر کر دیا گیا ہے، مگر اس کا مطلب کسی کے نزدیک بالکل یہ نہیں کہ اس طور پر تین طلاقیں دینا مسنون اور پسندیدہ ہے۔ طلاقِ بدعت کے مقابلے میں اس کو طلاقِ سنت اس معنی میں کہہ دیا گیا ہے کہ یہ صورت بھی بدعت میں داخل نہیں ہے۔

قرآن و سنت کے ارشادات اور تعامل صحابہ و تابعین سے جو کچھ عددِ طلاق کے بارے میں ثابت ہوتا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب طلاق دینا ناگزیر ہو جائے تو اس کا احسن طریقہ یہ ہے کہ صرف ایک طلاق ایسے طہر میں دے دے جس میں مجامعت نہ کی ہو اور پھر ایک طلاق کے بعد عورت کو چھوڑ دے۔ عدت ختم ہوتے ہی رشتہ نکاح از خود ٹوٹ جائے گا۔ اسی کو فقہاء نے طلاقِ احسن کہا ہے اور صحابہ کرامؓ نے اسی کو طلاق کا بہترین طریقہ قرار دیا ہے۔ مصنف ابن ابی شیبہؒ میں حضرت ابراہیم نخعیؒ سے نقل ہے کہ صحابہ کرامؓ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین طلاق دینے میں اس کو پسند کرتے تھے کہ صرف ایک طلاق دے کر چھوڑ دیا جائے اور عدتِ طلاق تین حیض پورے ہونے دیے جائیں تاکہ عورت آزاد ہو جائے۔ قرآن پاک کے مذکورہ الفاظ سے اس بات کی اجازت بھی نکلتی ہے کہ دو طلاق تک دے دی جائیں۔ مگر مَوْتَانِ کے لفظ میں اس بات کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ یہ دو طلاق بیک وقت نہ ہوں، بلکہ دو طہروں میں الگ الگ ہوں۔ الطلاق طلاقان سے بھی دو طلاق کی اجازت ثابت ہو سکتی تھی، لیکن مَوْتَانِ میں ایک ترتیب اور ترانخی کی طرف اشارہ ہے کہ دو طلاقیں ہوں تو الگ الگ ہوں۔ مثلاً کوئی شخص کسی کو دو روپے ایک دفعہ دے دے تو اس کو دو مرتبہ دینا نہیں کہا جائے گا۔ الفاظ قرآن میں دو مرتبہ دینے کا مقصد یہی ہے کہ الگ الگ طہر میں دو طلاقیں دی جائیں۔ اسی کو فقہی اصطلاح میں طلاقِ

حسن کہا جاتا ہے۔ حدیث میں حضور پاک ﷺ سے تیسری طلاق کا مبغوض اور مکروہ ہونا ثابت ہے۔ محمود بن لبید انصاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

أَخْبَرَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ رَجُلٍ طَلَّقَ امْرَأَتَهُ ثَلَاثَ تَطْلِيقَاتٍ جَمِيعًا، فَقَامَ غَضْبَانٌ ثُمَّ قَالَ: «أَيْلَعُبُ بِكِتَابِ اللَّهِ وَأَنَا بَيْنَ أَظْهَرِكُمْ» حَتَّى قَامَ رَجُلٌ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ أَلَا أَقْتُلُهُ؟ (۴۵)

”رسول اللہ ﷺ کو ایک آدمی کے متعلق خبر دی گئی جس نے اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دی تھیں۔ آپ غصہ کی حالت میں کھڑے ہو گئے اور فرمایا: کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ کھیل کیا جاتا ہے، حالانکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں!“ اتنے میں ایک آدمی کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! کیا میں اس کو قتل نہ کروں؟“

فقہ میں اسی کو طلاق بدعت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ گویا اسلامی شریعت نے جو طلاق کے تین درجے تین طلاقیں کی صورت میں رکھے ہیں اس کا ہرگز مطلب یہ نہیں کہ ان تین درجوں کو عبور کرنا ضروری ہے بلکہ شریعت کا منشا یہ ہے کہ اول تو طلاق کا قدم ہی ایک مبغوض اور مکروہ فعل ہے اگر باہر مجبوری اس کی نوبت آ ہی جائے تو صرف ایک طلاق پر اکتفا کیا جائے اور عدت گزرنے دی جائے۔ یہی ایک طلاق رشتہ نکاح ختم کرنے کے لیے کافی ہوگی اور عورت آزاد ہو کر دوسرے مرد سے نکاح کر سکے گی۔ اس میں یہ حکمت بھی ہے کہ طرفین کے لیے مصالحت کی راہ کھلے گی۔ عدت سے پہلے رجوع کر لینا کافی ہوگا اور عدت ختم ہونے کے بعد اگر چہ نکاح ٹوٹ جائے گا اور عورت آزاد ہو جائے گی پھر بھی یہ گنجائش باقی رہے گی کہ دونوں میں اگر مصالحت ہو جائے تو نکاح جدید سے دوبارہ اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ اب اگر کوئی اس طلاق احسن پر اکتفا نہ کرے اور دوران عدت صریحاً ایک اور طلاق دے دے تو اس نے قطع نکاح کے دو درجے طے کر لیے، جس کی نہ تو ضرورت تھی اور نہ ہی یہ شرعاً پسندیدہ ہے مگر ان دو درجوں کے طے ہونے کے بعد بھی عدت میں رجعت کا اختیار رہے گا اور عدت ختم ہونے کے بعد مصالحت کی صورت میں طرفین دوبارہ تجدید نکاح کر سکتے ہیں۔ گویا یہ شخص اب طلاق کی سرحد تک پہنچ گیا۔

دو درجے طلاق کے طے کر لینے کے بعد اب آگے کے لیے یہ ہدایت دی گئی کہ ﴿فَامْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ﴾ اس میں فَامْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ کے لفظوں میں دو حکم بتلائے گئے۔ پہلے یہ کہ عدت کے دوران رجعت کر لینا نکاح جدید کا محتاج نہیں بلکہ صرف اِمْسَاكٌ یعنی طلاق سے رجعت کر کے روک لینا ہی کافی ہے اس سے تعلق زوجیت بحال ہو جائے گا۔ دوسرے اس میں شوہر کو ہدایت دی گئی ہے کہ اگر اس کا ارادہ اصلاح حال اور صلح و صفائی کے ساتھ گھر بسانے کا ہے تو رجعت کرے ورنہ چھوڑ دے کہ عدت گزر کر تعلق زوجیت ختم ہو جائے۔ ایسا نہ ہو کہ بغیر اصلاح کی نیت کے محض عورت کو پریشان کرنے کے لیے رجعت کرے۔

اس کے بالمقابل اَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ فرمایا گیا۔ تَسْرِيح کے معنی کھول دینے اور چھوڑ دینے کے ہیں۔ اس میں یہ اشارہ مضمحل ہے کہ اب قطع تعلق کے لیے کسی مزید طلاق یا دوسرے عمل کی ضرورت نہیں رجعت کے بغیر عدت کا ختم ہو جانا ہی تعلقات زوجیت کے ختم کرنے کو کافی ہے۔ سنن ابی داؤد میں روایت ہے کہ اس

آیت کے نزول پر ایک شخص نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اَلطَّلَاقِ مَرَّتَيْنِ تو فرمایا، تیسری طلاق کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ آپ ﷺ نے جواب دیا کہ تَسْرِيعُ بِإِحْسَانٍ جو بعد میں مذکور ہے، وہی تیسری طلاق ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ ازدواجی تعلق کے ختم ہونے کا جو کام تیسری طلاق سے ہوتا ہے، وہی کام اس طرزِ عمل سے ہو جائے گا، بشرطیکہ عدت کے دوران رجعت نہ کرے۔ جس طرح اِمْسَاكُ کے ساتھ بِمَعْرُوفٍ کی قید لگا کر یہ ہدایت فرمادی کہ اگر رجعت کر کے بیوی کو روکا جائے تو حسن سلوک کے ساتھ روکا جائے، اسی طرح تَسْرِيعُ کے ساتھ بِإِحْسَانٍ کی قید لگا کر یہ ہدایت بھی دے دی کہ طلاق ایک معاملہ کا ختم (فسخ) کرنا ہے۔ شریف انسان کا کام یہ ہے کہ جس طرح معاملہ اور معاہدہ خوش دلی اور حسن سلوک سے کیا جاتا ہے، اسی طرح اگر معاہدہ ختم کرنے کی بھی نوبت آئے تو اس کو بھی لڑائی جھگڑے کے ساتھ نہیں بلکہ احسان اور حسن سلوک کے ساتھ ختم کریں، کہ بوقتِ رخصتی مطلقہ بیوی کو کچھ تحائف اور کپڑے وغیرہ (پہننے کا لباس) دے کر رخصت کیا جائے۔ جیسا کہ سورۃ البقرۃ آیت ۲۳۶ میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَمَتَّعُوْهُنَّ عَلَى الْمَوْسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتَرِ قَدَرُهُ﴾ یعنی مطلقہ بیوی کو کچھ کپڑا لٹا دے کر رخصت کریں، اپنی اپنی مالی حیثیت کے مطابق۔ اگر کسی نے اب بھی ایسا نہ کیا بلکہ تیسری طلاق بھی دے ڈالی تو اپنے سارے اختیارات اور شرعی سہولتوں کو بلاوجہ ختم کر دیا۔ اب اس کی سزا یہی ہے کہ نہ تو رجعت ہو سکے اور نہ ہی عورت کی کسی دوسری جگہ شادی اور آزادی کے بغیر باہمی نکاح ہو سکے۔

اب آخری مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی نے غیر مشروع طریقہ اختیار کر کے بیک وقت تین طلاقیں دے دیں تو کیا وہ مؤثر ہو جائیں گی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ یہ طریقہ حضور ﷺ کی ناراضگی کا موجب ہوا، اور جمہور امت اور فقہاء میں سے بعض کے نزدیک غیر مستحسن اور بعض کے نزدیک ناجائز ہے۔ اس سب کے باوجود اگر کسی نے یہ قدم اٹھا لیا تو ائمہ اربعہ کے نزدیک تین طلاقیں واقع ہو گئیں اور ساتھ ہی نہ صرف رجعت بلکہ نکاح جدید کا اختیار بھی مکمل ختم ہو گیا۔ احادیث کی روشنی میں چاروں مسالک کے ائمہ اور جمہور فقہاء کا اس پر اتفاق ہے اور بعض نے اس پر اجماع کا کہا ہے۔ البتہ کچھ فقہاء اور اہل ظاہر اس کو ایک مانتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ایک طلاق کے بعد کی دوسری طلاقیں تاکید کے لیے ہیں۔ اس حوالے سے صحیحین کی ایک حدیث حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت سے پیش خدمت ہے: ”ایک آدمی نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں۔ اس عورت نے دوسری جگہ نکاح کیا تو اس دوسرے شخص نے بھی اسے طلاق دے دی۔ حضور اکرم ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیا یہ عورت پہلے شوہر کے لیے حلال ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”نہیں“ جب تک دوسرا شوہر اس سے ہم بستری کر کے لطف اندوز نہ ہو جائے جس طرح پہلے شوہر نے کیا تھا، اس وقت تک طلاق دینے والے پہلے شوہر کے لیے حلال نہ ہوگی۔“

الفاظِ حدیث سے یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ تینوں طلاقیں بیک وقت دی گئی تھیں۔ شروع حدیث فتح الباری

عمدة القاری قسطلانی وغیرہ میں روایت کا یہی مفہوم قرار دیا گیا ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں دی تھیں۔ ساتھ ہی حدیث میں حضور ﷺ کا منشا بھی واضح ہے کہ آپ نے ان تینوں طلاقوں کو نافذ قرار دے کر یہ حکم دیا کہ جب تک شوہر ثانی سے ہم بستری اور صحبت نہ ہو جائے، وہ عورت اس تین طلاق دینے والے شوہر اول کے لیے حلال نہ ہوگی۔ اس کے ساتھ بیوہ عورت کے حقوق کے حوالے سے بھی ارشاد نبویؐ ہے:

(۱) ((السَّاعِي عَلَى الْأَمَلَةِ وَالْمُسْكِينِ كَالْمُجَاهِدِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ)) (۴۶)

”کسی بے چاری بے شوہر والی عورت یا کسی مسکین حاجت مند کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا بندہ (اللہ کے نزدیک اور اجر و ثواب میں) راہِ خدا میں جہاد کرنے والے بندے جیسا ہے۔“

(۲) اَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ لَكَ يَأْسِرَاقَةُ ((أَلَا أَذْلُكَ عَلَى أَعْظَمِ الصَّدَقَةِ)) قَالَ بَلَى يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ: ابْنَتُكَ مَزْدُودَةٌ إِلَيْكَ لَيْسَ لَهَا كَأْسَبٌ غَيْرُكَ)) (۴۷)

”حضرت سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں افضل ترین صدقہ نہ بتاؤں؟ (افضل ترین صدقہ یہ ہے کہ) تم اپنی اس لڑکی پر خرچ کرو جو طلاق کی وجہ سے یا بیوہ ہو کر تمہارے پاس واپس آگئی اور تمہارے علاوہ اس کے لیے کوئی کمائی کرنے والا نہیں ہے۔“

اُس وقت کی دینی صورت حال ہی ایسی تھی کہ لوگ جو کہتے تھے، ان کا مطلب بھی وہی ہوتا تھا اور انہیں طلاق کے صحیح طریقہ کار کی بھی کافی حد تک سوجھ بوجھ تھی۔ آج کے دور میں جبکہ عوام کی دینی حالت بالکل ناگفتہ بہ ہے اور انہیں طلاق کے شرعی طریقہ کار کا کچھ علم نہیں، اپنی لاعلمی میں وہ یہی سمجھتے ہیں کہ تین طلاق کے بغیر شاید صحیح طلاق ہوئی ہی نہیں، ایسے میں گھریلو ادارے کو بچانے اور عائلی زندگی کو برباد نہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ فقہائے کرام اس حوالے سے اجتہاد کریں اور شرعی حدود و قیود کے اندر اندر اور مصالح عوام الناس کو ملحوظ رکھتے ہوئے کوئی ایسا راستہ تجویز کریں جو مزاج شریعت کے بھی مطابق ہو اور فقہ الواقع کے موافق بھی! تاکہ اس حوالے سے عوام کی اکثریت فتنے میں مبتلا ہونے سے بچ سکے۔

تعدّ و ازدواج اور متعلقہ مباحث

اس حوالے سے پہلے سورۃ النساء کی متعلقہ آیت کا ترجمہ اور تشریح پیش خدمت ہے:

﴿وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَمَلَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَنَىٰ وَنَلَكَ وَرِيعٌ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا ۝﴾ (النساء)

”اگر تم ڈرو کہ یتیم لڑکیوں کے حق میں انصاف نہ کر سکو گے، تو جو عورتیں تمہیں پسند آئیں، ان میں سے دو دو اور تین تین اور چار چار سے نکاح کرلو۔ پھر اگر تم ڈرو کہ ان میں انصاف نہ کر سکو گے تو ایک ہی سے نکاح

کر دیا کہ تم جو تمہاری ملکیت ہے، اس سے امید ہے کہ تم ایک طرف نہ جھک پڑو گے (یا ظلم نہ کرو گے)۔“

تُقْسِطُوا باب افعال سے ہے اور یہاں اس میں سَلْب کا خاصہ پایا جا رہا ہے، یعنی اگر تمہیں ظلم کا خوف

ہو۔ صاحبِ تفہیم القرآن کے مطابق اہل تفسیر نے اس کے تین مفہوم بیان کیے ہیں:

(۱) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں جو یتیم بچیاں لوگوں کی سرپرستی میں ہوتی تھیں، وہ ان کے مال یا حسن و جمال کی بنا پر ان سے شادی کر لیتے تھے۔ یا اس خیال سے نکاح کرتے کہ ان کا کوئی والی وارث نہیں جو ان کے حقوق کی نگہبانی کرے، ہم جس طرح چاہیں ان کے ساتھ رویہ اختیار کریں گے، اور پھر ان پر ظلم و ستم کرتے۔ اس پر ارشادِ خداوندی ہوا کہ اگر تم کو اندیشہ ہے کہ ایسی یتیم لڑکیوں کے ساتھ انصاف نہ کر سکو گے، تو دوسری عورتوں میں سے جو تمہیں پسند آئیں، ان سے نکاح کر لو۔

(ب) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ان کے شاگرد عکرمہ اس کی تفسیریوں بیان کرتے ہیں کہ جاہلیت میں نکاح کی کوئی حد نہ تھی۔ ایک شخص دس دس بیویاں کر لیتا اور جب کثرتِ ازواج سے مصارف بڑھ جاتے تو مجبوراً یتیم بھتیجیوں، بھانجوں اور دوسرے لاچار عزیزوں کے حقوق پر دست درازی کرتا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے چار کی حد مقرر فرمادی اور ارشاد ہوا کہ ظلم اور بے انصافی سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ ایک سے چار تک اتنی عورتوں سے نکاح کرو جن کے ساتھ تم راہِ عدل پر قائم رہ سکو اور تمہیں یتیموں کا مال ناحق لینے کی ضرورت نہ پڑے۔

(ج) ابن جریر، سعید بن جبیر، قتادہ، ضحاک اور بعض دیگر مفسرین کا کہنا ہے کہ جہاں تک یتیموں کا معاملہ ہے، ایامِ جاہلیت میں بھی ان کے ساتھ ظلم و زیادتی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ لیکن عورتوں کے معاملے میں معاشرے کا مجموعی ذہن عدل و انصاف کے تصور سے بالکل خالی تھا۔ وہ لوگ جتنی چاہے شادیاں کر لیتے اور پھر ان منکوحہ عورتوں کے ساتھ ظلم اور بے انصافی کا برتاؤ کرتے۔ اس لیے ارشادِ خداوندی ہوا کہ اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو، تو دوسری عورتوں کے ساتھ بھی ظلم و زیادتی کرنے سے ڈرو۔ چار سے زیادہ تو بالکل ہی نکاح نہ کرو، اور یہ چار کی حد بھی صرف اتنی ہی بیویوں کے ساتھ ہے جن کے ساتھ تم پورا عدل و انصاف کر سکو۔

(د) اس آیت کا ایک مفہوم یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اگر تم یتیموں کے معاملے میں ظلم اور بے انصافی سے ڈرتے ہو، تو بہتر ہے کہ ان عورتوں سے نکاح کرو جن کے ساتھ یتیم بچے ہوں، وہ ان یتیموں کی دیکھ بھال تم سے زیادہ بہتر طور پر کر سکتی ہیں۔

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنی خالہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس آیت کا مطلب دریافت کیا تو آپؓ نے فرمایا: یہ ذکر ان یتیم لڑکیوں کا ہے جو اپنے اولیاء (واحدوں) سرپرست (کے زیر پرورش) (زیر کفالت) ہوں، اور غیر محرم ولی جیسے چچا زاد بھائی ان کے مال اور جمال کی بنا پر ان میں رغبت رکھتا ہے۔ چاہتا ہے کہ ان سے نکاح کر لے، لیکن جو مہران (یتیم) لڑکیوں کو اور جگہ سے ملتا ہے یہ اسے اتنا نہیں دیتا تو پھر اسے منع کیا جا رہا ہے کہ ان کے ساتھ بغیر عدل کے نکاح کا ارادہ چھوڑ دے اور دوسری عورتوں کے ساتھ اپنا نکاح کر لے۔ (صحیح بخاری)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے (مزید) فرمایا کہ لوگوں نے پھر (دوبارہ) حضور ﷺ سے اسی بارے میں پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے اس پر یہ آیت نازل فرمائی: ﴿وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ ۚ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ ۚ وَمَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ فِي يَتِمَّى النِّسَاءِ الَّتِي لَا تُولَدْنَ لَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُونَ أَنْ تَنْكِحُوهُنَّ﴾ (النساء: ۱۲۷) ”(اے نبی ﷺ!) یہ لوگ آپ سے عورتوں کے معاملہ میں فتویٰ پوچھتے ہیں۔ کہہ دیجیے کہ اللہ تمہیں فتویٰ دیتا ہے (وضاحت کرتا ہے) ان کے بارے میں اور جو تمہیں (پہلے سے) سنایا جا رہا ہے کتاب میں یتیم لڑکیوں کے بارے میں جن کو تم دیتے نہیں ہو جو اللہ نے ان کے لیے لکھ دیا ہے اور چاہتے ہو کہ ان سے نکاح بھی کرو۔“ (۳۸)

اس آیت میں واضح ارشاد ہوا کہ جب یتیم لڑکی خوبصورت اور صاحب مال ہوتی ہے تو سرپرست (ولی) اس میں رغبت رکھتے اور نکاح کی صورت میں پورا مہر نہ دیتے۔ اور جب وہ خوبصورت اور صاحب مال نہ ہوتی تو اس میں کچھ رغبت نہ رکھتے اور دوسری عورتوں کو تلاش کرتے۔ تو اس حوالے سے فرمانِ خداوندی ہے کہ جس طرح تم ان (لڑکیوں) کو اس وقت چھوڑ دیتے ہو جب تم ان میں رغبت نہیں رکھتے تو ایسی صورت میں تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تم ان سے رغبت رکھتے ہوئے نکاح کرو؛ لیکن اس صورت میں کہ تم پورا مہر دیتے ہوئے ان کے تمام حقوق مکمل ادا کرو۔

زمانہ جاہلیت میں یہ رواج بھی عام تھا کہ جن لوگوں کی ملکیت اور کفالت میں ایسی یتیم لڑکیاں ہوتیں جن کی شکل و صورت اچھی اور مال بھی ان کے پاس ہوتا، تو ان کے سرپرست خود یا اپنی اولاد سے ان کا نکاح کرا دیتے۔ اس طریقے سے جتنا چاہا کم سے کم مہر مقرر کر لیا، جیسے چاہا بڑے طریقے سے انہیں رکھا اور بالآخر ان کے مال و جائیداد پر بھی قبضہ کر لیا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے صحیح بخاری میں روایت ہے کہ عہد رسالت میں ایسا ایک واقعہ پیش آیا۔ ایک شخص کی کفالت میں ایک یتیم لڑکی تھی۔ اس کا اپنا ایک باغ بھی تھا جس میں یہ یتیم لڑکی شریک تھی۔ اس شخص نے اس یتیم لڑکی سے نکاح کر لیا اور بجائے کہ اسے اپنے پاس سے مہر دیتا، اس کے باغ کے حصے پر بھی قبضہ کر لیا، اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔ یعنی اگر تمہیں یہ خطرہ ہو کہ یتیم لڑکیوں سے اپنا نکاح کرنے میں تم عدل و انصاف پر قائم نہ رہو گے، بلکہ ان کی حق تلفی ہو جائے گی، تو تمہارے لیے دوسری عورتیں بہت ہیں۔ ان میں سے ایسی عورتوں سے نکاح کر لو جو تمہارے لیے حلال اور تمہیں پسند ہیں۔ (معارف القرآن)

﴿فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ﴾ کا بہتر مفہوم یہ ہے کہ جن عورتوں کو تمہارے نفس اچھا جانیں اور تمہارے نفس ان کی طرف مائل ہوں۔ یہ مفہوم دیگر تمام تاویلات کے لحاظ سے زیادہ مناسب لگتا ہے۔ اس حوالے سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول کہ تم یتیم عورتوں سے شادی نہ کرو اور بالغ عورتوں سے شادی کرو (صحیح البخاری) کا معنی یہ ہوگا کہ اگر تمہیں خوف ہو کہ یتیموں کے ضعف اور ان کے والی وارث نہ ہونے کی وجہ سے ان کے ساتھ انصاف نہ کر سکو گے، تو دوسری عورتوں سے نکاح کر لو، جنہیں تم پسند کرتے ہو۔ کیونکہ اس صورت میں

خواہ وہ بالغ ہو یا یتیم، تمہارا قلبی میلان ہی ان کے حقوق کا محافظ ہوگا۔ ایک اور نکتہ یہ بھی ہے کہ اگر منکوحہ عورت نفس کو محبوب ہو تو وہ مرد کو زنا سے بھی بچاتی ہے۔ اس میں کچھ دیگر تاویلات بھی ہیں کہ عورتوں میں جو حلال ہیں (یعنی جن سے نکاح حرام نہ ہو) وہ عورتیں جو کہ بالغ ہوں۔ اسی حوالے سے مجاہد کا قول ہے کہ زنا سے بچو اور ان عورتوں سے نکاح کرو جو تمہارے لیے حلال ہیں۔ (تفسیر مظہری)

یہاں النِّسَاء کا لفظ اگرچہ ظاہر میں عام ہے اور اسی پر اتفاق ہے، لیکن صاحب تدبر قرآن نے اس سے عام عورتیں نہیں بلکہ یتیموں کی مائیں مراد لی ہیں اور اسے قرینہ دلیل کے مطابق قرار دیا ہے۔

﴿مَثْنٰی وَثُلَاثَ وَرُبْعَ﴾ یہ کلمات اعداد مقررہ ثنتین ثنتین، ثلاث ثلاث اور اربع اربع سے معدول ہیں۔ یہ اسباب عدل اور وصف کی بنا پر غیر منصرف ہیں اس لیے کہ یہ کلمات بطور صفت کے وضع کیے گئے ہیں جبکہ جن کلمات سے یہ بنے ہیں وہ صفت کے لیے وضع نہیں کیے گئے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ غیر منصرف اس لیے ہیں کیونکہ ان میں عدل کا تکرار ہے جبکہ یہ لفظ ثنتین سے اور اس کے معنی سے معدول ہیں۔ یہ کلمات مَا طَابَ لَکُمْ، جَوْفَانِکُمُو کا مفعول بہ ہے سے حال ہیں۔

صحیح بات یہی ہے کہ مثنیٰ او ثلاث یا مثنیٰ و ثلاث کے مفہوم میں کوئی تفاوت نہیں۔ نہ یہاں یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ تمام امت کا ان تینوں اقسام میں سے کسی ایک پر مجتمع ہونا ضروری ہے اور نہ ہی اس طرف خیال جاتا ہے کہ مختلف اقسام پر اتفاق لازم ہے۔ یہاں واؤ کا استعمال اس بنا پر ہوا کہ جب مجموعہ کا مجموعہ سے مقابلہ ہو تو واؤ افراد کی تقسیم میں زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔ اسی حوالے سے قرآن پاک میں ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

”﴿جَاعِلِ الْمَلٰٓئِکَہٗ رُسُلًا اُولٰٓئِیْ اٰجِنَحَہٗ مَثْنٰی وَثُلَاثَ وَرُبْعَ﴾“ (فاطر: ۸)

”جن فرشتوں کو اللہ تعالیٰ اپنا قاصد بنا کر بھیجتا ہے ان میں سے بعض دو، دو پروں والے، بعض تین تین پروں والے اور بعض چار چار پروں والے ہیں۔“ (بحوالہ تفسیر مظہری)

امام شافعی کا کہنا ہے کہ حدیث قرآن کی وضاحت کرنے والی ہے اور اس نے بتا دیا کہ کسی بھی مسلمان کے لیے بیک وقت چار بیویوں سے زائد رکھنا کسی حالت میں بھی جائز نہیں، سوائے رسول اللہ ﷺ کے اور یہ آپ کی فضیلت ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

گویا اس آیت میں ایک طرف تو اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ ایک سے چار تک عورتیں بیک وقت نکاح میں جمع ہو سکتی ہیں۔ دوسری طرف یہ پابندی بھی مکمل طور پر عائد کر دی گئی کہ چار سے زائد عورتیں ایک ہی وقت نکاح میں اکٹھی نہیں کی جاسکتیں۔ حدیث رسول سے اس آیت کی تشریح یوں ملتی ہے۔ اس آیت کے نزول کے بعد غیلان بن اسلمہ ثقفی رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو ان کے نکاح میں دس عورتیں تھیں، اور وہ بھی سب ان کے ساتھ مسلمان ہو گئیں۔ اب حضور ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ فرمان الہی کے مطابق ان میں سے چار کو منتخب کر لیں اور بقیہ عورتوں کو طلاق دے دیں۔ چنانچہ انہوں نے حضور ﷺ کی ہدایت کے مطابق چار عورتیں نکاح میں رکھ کر

بقیہ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ (ترمذی، ابن ماجہ، مشکوٰۃ)

مسند احمد میں اسی روایت کے تکرار میں ایک واقعہ بھی مذکور ہے، اس کا ذکر بھی فائدہ سے خالی نہیں، کیونکہ اس کا تعلق بھی حقوق نسواں سے ہی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں غیلان بن اسلمہ نے اپنی چار ازواج کو بھی طلاق دے دی اور اپنا کل مال و اسباب اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب اس کی اطلاع ملی تو آپ نے غیلان بن اسلمہ کو طلب کر کے فرمایا کہ تم نے اپنی بیویوں کو الگ کر دیا (طلاق دے دی) کہ وہ تمہارا مال نہ پائیں اور اپنا مال (تم نے) اپنی (زریعہ) اولاد میں تقسیم کر دیا۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اپنی بیویوں سے رجوع کر لو اور اپنی اولاد سے مال واپس لے لو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو میں تمہارے (مرنے کے) بعد تمہاری ان مطلقہ بیویوں کو بھی تمہارا وارث بناؤں گا، کیونکہ تم نے اس ڈر سے طلاق دی ہے۔ اگرچہ امام بخاری نے اس اضافے کو ضعیف قرار دیا ہے، لیکن اس کے تمام راوی ثقہ اور شرط شیخین پر ہیں۔ امام بیہقی کے بقول دیگر تمام احادیث حضرت غیلان والی حدیث کی شاہد ہیں۔ (ابن کثیر)

اسی طرح حضرت قیس بن الحارث اسدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میں مسلمان ہوا تو میرے نکاح میں آٹھ عورتیں تھیں۔ میں نے حضور ﷺ کو اس سے مطلع کیا تو آپ نے فرمایا کہ ان میں سے چار کو رکھ لو، بقیہ کو طلاق دے دو۔ (ابوداؤد) مسند امام شافعی میں حضرت نوفل بن معاویہ دیلمی رضی اللہ عنہ کا واقعہ نقل ہوا ہے کہ جب وہ مسلمان ہوئے تو ان کی زوجیت میں پانچ عورتیں تھیں۔ اس پر حضور ﷺ نے ان کو بھی ایک عورت کو طلاق دینے کا حکم دیا (مشکوٰۃ میں اسے شرح الشہ سے نقل کیا گیا ہے)۔ گویا حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس تعامل سے یہ بات پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ اس آیت کی روشنی میں چار سے زائد عورتوں کو بیک وقت اپنے نکاح میں جمع کرنا مطلقاً حرام ہے۔

﴿فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ﴾ ”اگر تمہیں اس بات کا خوف ہو کہ عدل نہیں کر سکو گے، تو (پھر) ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو یا جو کنیز (شرعی اصول کے مطابق) تمہاری ملکیت میں ہو (اسی سے گزارہ کر لو)۔“ آیت کے اس حصے سے پتا چلتا ہے کہ کسی مسلمان کے لیے ایک سے زیادہ نکاح کرنا صرف اس صورت میں جائز اور صحیح ہے، جب شریعت کے مطابق ساری بیویوں کے درمیان عدل اور برابری کی جا سکے اور ان کے باہمی حقوق کا پورا لحاظ ہو۔ آیت میں یہ جو ارشاد ہوا: ﴿أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ﴾ ”یا کنیز (لونڈی) پر ہی گزارہ کر لو“ تو یہاں یہ بات پورے طور سے سمجھنے والی ہے کہ اس مملوکہ کنیز کی شریعت میں خاص شرائط ہیں جو کہ موجودہ زمانہ میں پوری نہیں ہوتیں۔ اس لیے اہل فتویٰ اس پر متفق ہیں کہ آج کل کسی کو شرعی کنیز سمجھ کر بے نکاح گھر قبضہ میں رکھنا بالکل حرام ہے۔

گویا یہاں سے یہ سبق ملتا ہے کہ اگرچہ قرآن پاک نے چار تک شادیاں کرنے کی اجازت دی ہے اور بیک وقت چار بیویاں رکھنا بھی جائز ہے، لیکن ایک سے زائد بیویاں ہونے کی صورت میں ان کے انفرادی حقوق

اور اجتماعی طور پر ان کے باہمی حقوق کے درمیان عدل و انصاف قائم رکھنا واجب ہے اور حقوق کی ادائیگی میں برابری نہ کرنا گناہ عظیم ہے۔ یہاں تعددِ اِزواج (ایک سے زائد بیویاں رکھنا) کی اجازت عدل کرنے کے ساتھ مشروط ہے۔ اب جو شخص تعددِ اِزواج کی صورت میں عدل و انصاف کی شرط پر پورا نہیں اترتا، وہ گویا اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔ اس صورت میں اسے اپنا انجام ذہن میں رکھنا چاہیے۔ اگر دل میں اس بات کا ڈر ہو کہ سب سے عدل نہیں ہو پائے گا تو پھر ایک ہی پر قناعت کرنی چاہیے اور وقتی مصالح کے لیے ایک سے زائد نکاح کر کے خواہ مخواہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب نہیں کرنا چاہیے۔ البتہ حق تلفی کی صورت میں متعلقہ بیوی قاضی کے ہاں عدالت میں دعویٰ کر کے اپنا حق وصول کر سکتی ہے۔ اور بوقت ضرورت عدالت بھی مداخلت کر کے ایسی عورت کی دادرسی کر سکتی ہے۔

ابو جعفر نے فَوَاحِدَةً كَوْفَوَاحِدَةً یعنی مرفوع پڑھا ہے کہ یہ فعل محذوف کا فاعل ہے یا پھر مبتدأ محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی: فتكفيكم واحدةً یا فالمنقوع واحدةً (تفسیر مظہری) شہوت کا غلبہ ہونے کی صورت میں بالاجماع نکاح کرنا فرض عین ہے بشرطیکہ نان و نفقہ دینے پر قادر ہو اور شہوت کا غلبہ نہ ہونے کی صورت میں مسنون ہے بشرطیکہ فتنہ اور حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کا خوف نہ ہو۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ”اے جوانو! جو تم میں سے نکاح کرنے کی طاقت رکھتا ہے وہ نکاح کر لے اور جو نکاح کی طاقت نہیں رکھتا، وہ روزے رکھے کیونکہ روزہ اس کی شہوت کو توڑنے کا باعث ہے۔“ (متفق علیہ) امام احمد بن حنبلؒ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نکاح کا حکم دیتے تھے اور ترک نکاح کی سخت ممانعت کرتے تھے۔ ارشاد فرماتے کہ ”زیادہ بچہ جننے والی اور محبت کرنے والی عورتوں سے شادی کرو کیونکہ میں قیامت کے روز تم میں سے متقیوں کی کثرت کی بنا پر فخر کروں گا۔“ حضرت ابو ذرؓ سے مروی ایک حدیث میں آتا ہے کہ حضور پاک ﷺ نے حضرت عکاف بن خالد رضی اللہ عنہ سے فرمایا (پوچھا): ”کیا تیری بیوی ہے؟“ انہوں نے عرض کیا: نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ”لونڈی؟“ انہوں نے عرض کیا: وہ بھی نہیں۔ فرمایا: ”تم خوشحال ہو؟“ عرض کی: خوشحال ہوں۔ (اس پر) حضور ﷺ نے فرمایا: ”پھر تم شیطان کے بھائی ہو ہمارا طریقہ (سنت) تو نکاح کرنا ہے تم میں سے سب سے زیادہ برے نکاح نہ کرنے والے ہیں۔“ (سنن ابی داؤد) گویا جو آدمی وطی اور نفقہ دینے پر قادر ہو اس پر نکاح کرنا فرض عین ہے۔ (تفسیر مظہری) حضور کریم ﷺ نے ایک سے زائد نکاح کی صورت میں ان کے درمیان عدل و انصاف کی سخت تاکید فرمائی ہے اور اس شرط کے پورا نہ ہونے پر سخت وعیدیں سنائی ہیں۔ حضور ﷺ نے اپنے خانگی طرزِ عمل سے بھی اس بات کو پورے طور پر واضح کیا ہے۔ ارشاد نبویؐ ہے: ”جس شخص کے نکاح میں دو (یا زائد) عورتیں ہوں اور وہ ان کے حقوق میں عدل و انصاف نہ کر سکے، تو وہ روزِ قیامت اس طرح اٹھایا جائے گا کہ اس کا ایک پہلو گرا ہوا (فالج زدہ) ہوگا۔“ (سنن الترمذی، بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح)

البتہ یہ مساوات ان امور میں لازم ہے جو کہ انسان کے اختیار میں ہیں، مثلاً نفقہ اور شب باشی وغیرہ۔
البتہ ایسی بات جو انسان کے اختیار میں نہیں ہے، جیسے قلبی میلان اور محبت کسی سے زیادہ ہو جائے، تو اس غیر
اختیاری معاملے میں کوئی مواخذہ اور باز پرس نہیں، بشرطیکہ اس کا اثر اختیاری معاملات پر نہ پڑے۔

سورۃ النساء کی ایک دوسری آیت میں اس غیر اختیاری معاملے کا ذکر یوں کیا گیا ہے: ﴿وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا
أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ﴾ (آیت ۱۲۹) ”اور تم عورتوں کے بارے میں (ہر طرح سے) عدل
ہرگز نہ کر سکو گے، اگرچہ اس کی کتنی خواہش کر لو“۔ یہاں واضح کیا گیا کہ محبت اور میلان طبع ایک غیر اختیاری
معاملہ ہے، جس میں برابری اور انصاف کرنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ اسی آیت میں آگے اس غیر اختیاری
معاملے کی اصلاح کے لیے ارشاد ہوا: ﴿فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمِيلِ فَتَدْرُوا هَآ كَالْمُعَلَّقَةِ﴾ (آیت ۱۲۹) ”ایسے
بالکل ہی ایک طرف مائل ہو کر دوسری کو درمیان میں لٹکتی ہوئی (معلقہ) نہ چھوڑ دو“۔ یعنی اگر کسی ایک بیوی سے
زیادہ محبت قلبی ہو تو تم اس میں معذور ہو۔ اس کی کچھ وجوہات بھی ہو سکتی ہیں کہ ایک بد صورت ہے اور دوسری
خوبصورت، یا ایک سن رسیدہ ہے اور دوسری کم عمر، یا پھر ایک اخلاق والی اور صلح جو ہے جبکہ دوسری بداخلاق اور
جھگڑالو۔ لیکن اس صورت میں بھی دوسری بیوی سے مکمل بے اعتنائی اور بے توجہی ہرگز جائز نہیں، کہ وہ یہ محسوس
کرے کہ میں بے شو ہر ہوں۔ اس کی ایک صورت یہ بھی ہوتی کہ دوسری متاثرہ بیوی کو نہ ہی گھر میں صحیح طور سے
بسایا اور اس کے پورے حقوق ادا کیے اور نہ ہی اسے طلاق دی کہ اسے سکون حاصل ہو، دوسرا نکاح کر سکے بالکل
اچھوتوں کی طرح اسے اور اس کی اولاد کو ایک کونے میں ڈال کر یا دوسرے گھر میں رکھ کر بھول گئے اور خبر ہی نہ لی۔

ابتدائی آیت کے حصے ﴿فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً﴾ میں جس عدل اور برابری کا ذکر ہے، یہ
امور اختیاری کا ہی عدل ہے جس میں بے اعتدالی اور نا انصافی گناہ عظیم ہے۔ اسی حوالے سے حضور اکرم ﷺ
نے خود بھی اختیاری معاملات میں پورا عدل اور برابری کرنے کے بعد اللہ کے حضور عرض کیا: ”یا اللہ! یہ میری
برابروالی تقسیم ہے، ان چیزوں میں جو میرے اختیار میں ہیں۔ اب وہ چیز جو آپ کے قبضہ میں ہے، میرے اختیار
میں نہیں، اس پر مجھ سے مواخذہ نہ کرنا“ (ترمذی، نسائی، ابوداؤد، بحوالہ معارف القرآن)

مندرجہ بالا وضاحت کو نظر انداز کر دینے سے بعض لوگ سورۃ النساء کی پہلی والی آیت اور اس آیت کو باہمی
ملانے سے ایک عجیب مغالطے میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ابتدائے سورت میں حکم الہی ہے کہ اگر عدل و انصاف نہ
کر سکنے کا خطرہ ہو تو پھر ایک ہی پراکتفا کرو۔ اس بعد والی آیت میں قطعی طور پر فرمایا گیا کہ تم عدل و انصاف پر
قدرت ہی نہیں رکھتے۔ اب اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ ایک سے زائد نکاح کرنا جائز ہی نہیں ہے۔ سوچنے کی بات
ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا منشا یہی ہوتا کہ ایک سے زائد نکاح کرنا جائز ہی نہیں ہے تو پھر اس تفصیل کی بالکل حاجت
نہیں تھی کہ ﴿فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَنِّي وَتِلْكَ وَرُبْعٌ﴾ یعنی نکاح میں لے آؤ جو پسند آئیں
تمہیں عورتیں دودو، تین تین، چار چار اور پھر اس ارشاد کا کیا مفہوم ہوگا ﴿فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا﴾ یعنی اگر تمہیں

بے انصافی کا خطرہ ہو؟ کیونکہ اس صورت میں بے انصافی تو یقینی ہے، پھر خطرہ ہونے کا تو کوئی مفہوم ہی نہیں بنتا۔ خود نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عملی تعامل اور قولی بیان اس پر شاہد ہیں کہ اسلامی حکومت میں کبھی بھی ایک سے زائد نکاح کی ممانعت نہیں ہوئی۔ حقیقت یہی ہے کہ سورۃ النساء کی پہلی آیت میں اختیاری امور کے عدل اور برابری کا ذکر ہے اور دوسری آیت (۱۲۹) میں میلانِ قلبی اور محبت میں انصاف اور برابری پر قدرت نہ ہونے کا بیان ہے۔ ثابت ہوا کہ دونوں آیات میں کوئی تعارض نہیں اور نہ ہی ان میں تعدد از دواج سے مطلقاً روکے جانے کی کوئی دلیل موجود ہے۔ فقہائے کرام نے عدل بین الازواج (بیویوں کے درمیان عدل و انصاف) کو فرض قرار دیا ہے، لیکن خود عدل کی تفسیر ’عدمِ ظلم‘ سے کی ہے کہ کسی پر زیادتی نہ ہونے پائے۔

آیت کے آخر میں فرمانِ خداوندی ہے: ﴿ذَلِكَ اَدْنٰی اَلَّا تَعُوْلُوْا۟﴾ ”اس سے امید ہے کہ تم ایک طرف جھک جانے یا ظلم کرنے سے بچ جاؤ“۔ اس حصے میں دو کلمے ہیں۔ ایک ’ادنیٰ‘ یہ دُنُو سے مشتق ہے جو کہ قریب کے معنی میں ہے۔ دوسرا لَا تَعُوْلُوْا، یہ عَالٌ یَّعُوْلُ، مَالٌ یَّمِیْلُ کے معنی میں ہے جو کہ میلان کے مفہوم میں ہے۔ اور یہاں ناجائز میلان اور ظلم و جور کے معنی میں استعمال ہوا ہے (معارف القرآن)۔ عرب میں کہا جاتا ہے: عَالٌ فِی الْحُكْمِ جبکہ ظلم و جور کیا ہو۔ ابوطالب سے منسوب مشہور قصیدے کا شعر ہے:

بِمِيزَانٍ قَنِطٍ لَا یَحِسُّ شَعِیْرَةً
لَهُ شَهِدٌ مِّنْ نَّفْسِهِ غَیْرُ عَائِلٍ

یعنی ضمیر ایسی ترازو سے تولتا ہے جو ایک جو کی بھی کمی نہیں کرتی، اس کے پاس اس کا گواہ خود اس کا نفس ہے جو ظالم نہیں۔ ابوحاتم فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے کہ لَا تَعُوْلُوْا ”تم ظلم نہ کرو“ کے معنی میں ہے، اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباسؓ، مجاہد، عکرمہ، ابوما لک، نخعی، شعبی، ضحاک، قتادہ، سدی اور مقاتل بن حیان سے بھی یہی مروی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

صاحبِ تفسیرِ مظہری کے مطابق ایک عورت سے نکاح کرنا، کسی ایک طرف جھک جانے کے زیادہ قریب ہے۔ عرب بولتے ہیں عَال المیزاب، یعنی پرنا لہ ایک طرف جھک گیا۔ ’عَال الحاکم‘ اس وقت کہتے ہیں جب حاکم ایک طرف جھک جائے اور دوسرے پر ظلم کرے۔ عول الفریضة سے مراد معین حصوں سے پھرنا ہے۔ مجاہد نے ’اَلَّا تَعُوْلُوْا‘ سے مراد ”تم گمراہ نہ ہو جاؤ“ لیا ہے۔ فراء کا کہنا ہے کہ اس کا مفہوم ”اللہ تعالیٰ نے جو تم پر فرض کیا ہے، اس سے تجاوز نہ کر جاؤ“ ہے۔ عول کا معنی حد سے تجاوز کرنا بھی ہے۔ اسی سے ایک اصطلاح ’عول الفرائض‘ مستعمل ہے۔ ’نعولوا‘ کی تحقیق میں علامہ قرطبی، حضرت ابن عباسؓ اور مجاہد سے نقل کرتے ہیں: ’یقال عَال الرجل یعول از اجار و مال ومنه، قولهم عَال السَّهْم عن المدق اذا مال عنه‘، یعنی عَال کا معنی ظلم کرنا، ایک طرف جھک جانا جب تیر نشانے سے ہٹ جائے تو کہتے ہیں کہ عَال السَّهْم (تفسیر ضیاء القرآن)

امام شافعی کا کہنا ہے کہ تم زیادہ عیال دار نہ ہو جاؤ۔ بقول بغوی، امام شافعی نے جو یہ تاویل اختیار کی ہے یہ کسی اور فقہیہ / عالم سے منقول نہیں۔ کیونکہ کثرت عیال کے لیے باب افعال استعمال ہوتا ہے۔

آیت کے آخری حصے میں جو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ عدل و انصاف نہ کر سکنے کی صورت ایک بیوی پر ہی اکتفا کرنا، یہ ایسی چیز ہے کہ جس کو اختیار کرنے سے تم ظلم و ستم کرنے سے بچ سکو گے۔ یہاں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک ہی بیوی ہوگی تو پھر ظلم و ستم کا کوئی موقع نہ ہوگا۔ اب لفظ اَدْنٰی بڑھا کہ یہ کیوں ارشاد ہوا کہ اس پر عمل پیرا ہونا اس بات کے قریب ہے کہ تم ظلم کرنے سے بچ جاؤ گے۔ جواب یہ ہے کہ لفظ اَدْنٰی بڑھا کہ اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا کہ چونکہ بہت زیادہ لوگ ایک بیوی سے بھی عدل کا برتاؤ نہیں کرتے اور اسے ظلم و جور کا نشانہ بنائے رکھتے ہیں اس لیے اس ظلم و ستم کا مکمل سد باب کرنے کے لیے صرف یہی کافی نہیں کہ ایک سے زائد نکاح نہ کرو۔ اس حد تک تو ٹھیک ہے کہ اس حال میں ظلم کا خطرہ کم ہو جائے گا اور تم عدل کے قریب پہنچ سکو گے، لیکن ظلم و جور سے مکمل چھٹکارا اس وقت ہی نصیب ہو سکتا ہے جبکہ ایک بیوی کے حقوق بھی پورے طور پر ادا کیے جائیں اس کے ساتھ حسن سلوک اور احسان کا معاملہ رکھا جائے، اس کی خامیوں سے درگزر اور اس کی کمزوریوں پر صبر کیا جائے، زیادتی کی صورت میں معافی کا رویہ اختیار کیا جائے، ساتھ ساتھ اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں پر بھی نظر ہو۔ حضور ﷺ کی سیرت کے متعلقہ حصے سے بھی سبق حاصل کیا جائے۔ پھر اس رویے پر اللہ تعالیٰ سے اجر کی امید رکھی جائے۔ (معارف القرآن)

اب دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے حق میں کیا ہدایت (سفارش) فرمائی ہے: ﴿وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ (النساء: ۱۹) یعنی اپنی بیویوں کے ساتھ بھلائی اور اچھے طریقے سے پیش آؤ۔ آج ہم سے کوئی بڑا افسریا عہدے دار کوئی سفارش کرے تو ہم فوراً اپنی عزت افزائی سمجھتے ہوئے اس پر من و عن عمل پیرا ہوں گے۔ ساتھ یہ بھی خوف ہوگا کہ اگر اس معاملے میں ہم سے کوئی کوتاہی ہوگئی تو پھر پتہ نہیں کہ ہمارا کیا حشر ہو۔ اب ذرا خدا لگتی کہیں کہ اللہ کی سفارش کے حوالے سے ہمارا کیا چلن ہے اور اس پر عمل پیرا نہ ہونے کی صورت میں ہمارا کیا حال بلکہ حشر ہوگا۔ ہمارا دعوائے پارسائی روز قیامت کہیں ہمارے گلے کا پھندا ہی نہ بن جائے۔ حکیم محمد اختر صاحب کے بقول اس حوالے سے مولانا اشرف علی تھانوی کا کہنا ہے کہ (اب) جو اپنی بیویوں کو ستائے، ان سے اچھے اخلاق سے پیش نہ آئے، اور (یوں) اللہ تعالیٰ کی (اس) سفارش کو رد کر دے یہ (پرلے درجے کا) بے غیرت مرد ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ((يَعْلَمَنَّ كَرِيْمًا)) یعنی عورتوں کا مزاج ایسا ہے کہ جو شوہر مہربان، شریف اور حقوق کی نگہداشت کرنے والے ہوتے ہیں، کسی غلطی اور کوتاہی پر انتقامی جذبہ نہیں رکھتے، ٹکے اور ڈنڈے مارنے کی بجائے ذہل روٹی اور انڈے کھلاتے ہیں، ایسے کریم النفس شوہروں پر یہ غالب آ جاتی ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ یہ گیلا نہیں دے گا، بدلہ نہیں لے گا اور ظلم و زیادتی نہیں کرے گا۔ ان پر عورتوں کی لفظی گولہ باری یوں ہوتی

ہے کہ ہم نے تو کہا تھا ایسے کپڑے لانا، تم کیا چیتھڑے اٹھالائے۔ اچھے جوتے کے لیے کہا تھا، تم کیا لیتھڑے اٹھالائے۔ بہتر پھل کے لیے کہا تھا، تم کیا گلاسز اگند اٹھالائے۔ اب مرد بیچارا اللہ کے حکم کے آگے سر جھکاتے ہوئے ہنسی مذاق میں بات ٹال دیتا ہے اور انہیں نرم و نازک مخلوق سمجھتے ہوئے معاف کر دیتا ہے۔

آگے فرمانِ نبوی ہے کہ ((وَيَغْلِبُهُنَّ لَيْسِمٌ)) یعنی کمینے لوگ ان (عورتوں) پر غالب آ جاتے ہیں۔ گویا کمینہ خصلت، بد فطرت، مردانگی کے خول میں قید اور قوامیت کے نشے میں بہکے ہوئے لوگ بول بک کر، گالم گلوچ کر کے اور گھونٹے جوتے یا ڈنڈے کا استعمال کرتے ہوئے عورتوں پر غالب آ جاتے ہیں۔ عورت طبعاً ویسے ہی کمزور حالات کے ہاتھوں لاچار ہوتی ہے اس کا کوئی والی وارث موقع پر موجود ہوتا نہیں۔ بیچاری کچھ زیر لب بول کر آنسو بہا کے اور آہ بھر کر آخر کار خاموش ہو جاتی ہے، لیکن اس طرح سے مرد سے متعلق اس کے من کی چاہت اور محبت رفتہ رفتہ دم توڑ دیتی ہے۔ ظاہر کی مجبوری ایک الگ چیز ہے۔ اس کے بعد حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ((فَاحْبِبْ اَنْ اَكُوْنَ كَرِيْمًا مَّغْلُوْبًا)) ”میں یہ محبوب رکھتا ہوں کہ کریم (ہی) رہوں چاہے مغلوب ہو کر“ ((وَلَا اَحِبُّ اَنْ اَكُوْنَ لَيْسِمًا غَالِبًا))^(۹۹) ”اور میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ میں (ان عورتوں) پر غالب آ جاؤں“ کمینہ خصلت اور بد اخلاق بن کر، ”کاش! اس آئینے میں ہر مسلمان اپنا چہرہ دیکھتا اور عبرت حاصل کر سکتا۔“

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن

اجابت از درِ حق بہر استقبال می آید

”مظلوموں کی آہ سے ڈرو کہ جب وہ اللہ کو پکارتے ہیں تو قبولیت حق ان کی دعا کا استقبال کرتی ہے۔“

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے کہ نبی مکرم ﷺ (حالات خواہ کچھ بھی ہوں) ہمیشہ مسکراتے ہوئے گھر میں داخل ہوتے تھے۔ آج یہ سنت بھی ہم سے چھوٹ چکی ہے۔ ہماری جس طرح اہل خانہ کے پاس آمد ہوتی ہے وہ ہر کوئی خوب جانتا اور سمجھتا ہے۔ مولانا حکیم محمد اختر کا کہنا ہے کہ (دنیا دار تو دنیا دار) جو دیندار ہیں وہ بھی (برغم خود) حضرت بازید بسطامیؒ اور خواجہ معین الدین اجمیریؒ بن کر گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ ہاتھ میں تسبیح اور مراقبے میں آنکھیں بند کیے ہوئے (چہرے پر کرختگی اور لب سلے ہوئے) گویا عرش پر رہتے ہیں اور فرش (والوں) کی خبر ہی نہیں۔ دوستوں میں خوب ہنسی مذاق ہوگا اور بیوی کے پاس پارسا اور سنجیدہ بزرگ بن جائیں گے۔ وہ بیچاری تعجب اور حیرانگی میں ہوتی ہے کہ یہ پتھر کا بنا بت کہاں سے آ بیٹھا ہے۔^(۵۰)

اس حوالے سے خلیفہ راشد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ایک سبق آموز واقعہ بھی پڑھئے: خلافت فاروقی میں کسی موقع پر ایک شخص حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضری کے لیے پہنچا تا کہ ان کی بارگاہ میں اپنی زبان دراز بیوی کے بارے میں شکایت کرے۔ جب وہ آپ کے دروازے پر آیا تو سنا کہ حضرت عمرؓ کی اہلیہ ان سے کچھ سخت اور نامناسب انداز میں بات کر رہی ہیں اور آپ خاموش ہیں۔ اس پر اس نے دل میں سوچا کہ یہاں تو خلیفہ وقت بھی اسی مسئلے سے دوچار ہیں۔ جب واپس جانے لگا تو حضرت عمرؓ کو خبر ہو گئی اور آپ نے اسے بلا بھیجا کہ کیا بات

ہے؟ تو اس شخص نے کہا کہ میں تو اپنی بیوی کی شکایت لے کر آیا تھا۔ جب یہاں بھی وہی صورت حال دیکھی تو واپس پلٹا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میری بیوی کے جو مجھ پر حقوق ہیں، ان کی وجہ سے میں اس کی باتوں کو درگزر کر دیتا ہوں۔ پہلا تو یہ کہ وہ میرے اور جہنم کے درمیان آڑ (رکاٹ) ہے، اس سے میرا دل پرسکون ہو جاتا ہے۔ دوسرا یہ کہ جب میں گھر سے باہر جاتا ہوں تو وہ میری آبرو کا خیال رکھتی اور میرے مال کی حفاظت کرتی ہے۔ تیسرے یہ کہ وہ میرے کپڑے دھوتی ہے۔ چوتھے یہ کہ وہ میرے بچوں کی نگہبان ہے۔ اور پانچویں یہ کہ وہ میرے لیے کھانا پکاتی ہے۔ یہ تمام باتیں سن کر اس شخص نے کہا کہ یہی معاملہ تو میرے ساتھ بھی ہے۔ جب آپؐ درگزر سے کام لیتے ہیں تو میں بھی کیوں نہ درگزر سے کام لوں! (۵۱)

یہی سبق ہم میں سے ہر ایک کے لیے ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کون مکمل سبق حاصل کرتا ہے۔
آخر میں حدیث نبویؐ ملاحظہ فرمائیں:

((الْمَرْأَةُ كَالضِّلَعِ، إِنْ أَقْتَمْتَهَا كَسَرَتْهَا، وَإِنْ اسْتَمْتَعْتَ بِمَا اسْتَمْتَعَتْ بِهَا وَفِيهَا عَوَجٌ)) (۵۲)

”عورت ٹیڑھی پللی کی طرح ہے، اگر اس کو سیدھا کرو گے تو ٹوٹنے تک پہنچ جائے گی“ (اس حالت میں)
اگر اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو تو فائدہ اٹھاؤ، اور اس میں ٹیڑھا پن رہے گا۔“



مقامِ نسواں کے حوالے سے علامہ اقبال کے اشعار بھی ملاحظہ فرمائیں:

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت ہے حضرتِ انساں کے لیے اس کا ثمر موت!
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت!
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسہ زن ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت!



وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا درِ مکنوں
مکالماتِ فلاطون نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطون



اک زندہ حقیقت میرے سینے میں ہے مستور
 کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد
 نہ پردہ نہ تعلیم ، نئی ہو کہ پرانی
 نسوانیت زن کا نگہاں ہے فقط مرد
 جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
 اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد!

حواشی

- (۴۱) معارف القرآن، جلد اول، سورة البقرة، آیت ۲۳۹۔
 (۴۲) سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب فی کراہیۃ الطلاق۔
 (۴۳) سنن الترمذی، ابواب النکاح، باب ما جاء فی المحل والمحلل لہ۔
 (۴۴) صحیح ابن ماجہ، ح ۱۵۸۳، ۱۵۸۴۔
 (۴۵) سنن النسائی، کتاب الطلاق، باب الثلاث المجموعۃ وما فیہ من التغلیظ۔ مشکاة المصابیح، کتاب النکاح، باب الخلع والطلاق۔
 (۴۶) صحیح البخاری، کتاب الادب، باب الساعی علی الارملۃ۔
 (۴۷) مسند احمد، کتاب مسند الشامیین، باب حدیث سراقۃ بن مالک بن جعشم، ح ۱۶۹۲۵۔
 (۴۸) صحیح البخاری، کتاب الوصایا، جلد ۱، بحوالہ تفسیر مظہری۔
 (۴۹) روح المعانی، ج ۵، ص ۱۴۔
 (۵۰) حقوق النساء، حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب، خانقاہ امدادیہ اشرفیہ، گلشن اقبال، کراچی
 (۵۱) ہفت روزہ خواتین کا اسلام، ناظم آباد کراچی، پرچہ ۷۴، جولائی ۲۰۱۷ء۔
 (۵۲) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب المدارۃ مع النساء، ح: ۵۱۸۴۔



بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے دو فکر انگیز خطابات پر مشتمل کتابچہ

توبہ کی عظمت اور تاثیر

اور موجودہ حالات میں کرنے کا اصل کام

اشاعت عام: 35 روپے

اشاعت خاص: 65 روپے

تعارف و تبصرہ

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

نام کتاب : حیات و خدمات امام بخاری رحمہ اللہ

مصنف : عبدالرشید عراقی

ضخامت: 128 صفحات، قیمت: درج نہیں

ناشر: جامعہ خاتم النبیین، اہل حدیث سمبول

امام بخاریؒ عالم اسلام کی مایہ ناز ہستی ہیں اور ان کی کتاب صحیح بخاری قرآن مجید کے بعد سب سے صحیح اور مستند کتاب ہے۔ امام صاحب اور ان کی کتاب کی عظمت اس بات سے ظاہر ہے کہ ان کے ذکر خیر پر چھوٹی بڑی درجنوں کتابیں لکھی گئی ہیں۔

زیر نظر کتاب کے مؤلف ملک عبدالرشید عراقی صاحب نامور شخصیت نگار ہیں، خصوصاً ائمہ حدیث کی حیات و خدمات ان کا خصوصی میدان تحریر ہے۔ ان موضوعات پر ان کے سینکڑوں مضامین معروف علمی مجلات میں شائع ہو چکے ہیں اور متعدد کتب بھی منظر عام پر آ چکی ہیں۔

اس کتاب میں مصنف نے امام بخاریؒ کی خدمات کو سراہا ہے۔ ۱۲۸ صفحات کی یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں امام صاحب کے حالات زندگی کے ضمن میں ان کی پیدائش سے لے کر وفات تک کا ذکر ہے۔ ان کو بے نظیر قوت حافظہ عطا ہوئی تھی۔ وہ خود داری، سادگی، قناعت اور زہد و تقویٰ میں اونچے مقام پر تھے۔ امام صاحب نے عباسی حکمرانوں کا زمانہ پایا۔ ان حکمرانوں میں سے اکثر کے علم و فضل کا ذکر کیا گیا ہے لیکن یہ بحث تشنہ رہی ہے کہ ان حکمرانوں نے امام صاحب کے ساتھ کیا سلوک کیا اور انہیں کس عظمت کا مستحق سمجھا۔ باب سوم میں امام صاحب کے اساتذہ اور تلامذہ کا ذکر ہے۔ پانچویں باب میں صحیح بخاری کا ذکر ہے کہ اس کی کتنی شروح اور حواشی لکھی گئیں اور عالم اسلام میں اسے کس قدر پذیرائی ملی۔ برصغیر کے نامور علماء نے صحیح بخاری پر کئی کتابیں لکھیں اور تراجم اور شروحات شائع کیں۔

مصنف نے ان لوگوں کا بھی ذکر کیا ہے جنہوں نے صحیح بخاری کی قدر نہ پہچانی اور اس پر بے جا تنقیدیں کیں۔ عالم اسلام کے تمام معروف اور غیر معروف مدارس اور مکاتب میں صحیح بخاری زیر درس ہے۔



- (۱) وحید الزماں قاسمی، القاموس الوحید، کتب خانہ دیوبند، جلد ۲، ص: ۳۸۸
- (۲) تقی عثمانی، آسان ترجمہ قرآن، مکتبہ معارف القرآن کراچی، ص: ۱۹۰۴
- (۳) جلال الدین المحلی و جلال الدین السيوطی، تفسیر الجلالین، دار المعرفہ بیروت، بدون صفحہ
- (۴) الامام الجوزی، زاد المسیر فی علم التفسیر، مکتب الاسلامی بیروت، جلد ۹، ص: ۶۵
- (۵) الراغب الاصفہانی، المفردات فی غریب القرآن، دار المعرفہ بیروت، ص: ۱۶۲
- (6) Muhammad Asad, The message of the Quran, Darul-Andulus Gibratter 1-941
- (۷) Oxford English Urdu Dictionary، اوسفر ڈیونیورٹی پریس، ص: ۴۲۰
- (8) Issa Rezazedhe, Dialougue Amoung civilizations, kanishka publishers, New Delhi, P: 23
- (۹) صالح بن عبد اللہ، اصول الحوار و آدابه فی الاسلام، دار المنارة السعودية، ص: ۴
- (10) Mustansir Mir. Dialougue, Encyclopedia of Quran index, volume Editor, Jane Dammen Maule, laiden P. 534
- (۱۱) محمد اکرام ورک، بین المذاہب مکالمہ کی اہمیت، ترجیحات اور تقاضے ماہنامہ الشریعہ، جولائی اگست ۲۰۰۶، ص: ۱۸
- (12) Murad Hoffman, Persuasion is the only way to present Islam to Europeans, Monthly 'DAWAH' Riyadh, August, 2003 P: 13
- (۱۳) ابوالاعلیٰ مودودی، ترجمان القرآن الکریم، شان پبلی کیشنز، حیدرآباد، ص: ۶۳۱
- (۱۴) عماد الدین ابی الفداء اسماعیل بن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، دارالاشاعت، دیوبند، جلد ۳



MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr. Israr Ahmad

Surah Al-Ma'idah

(The Repast / The table laden with food)

*(Recap of verses 20 – 34 of Surah Al-Ma'idah and fresh exposition of
verses 35 – 50 of the same Surah, inclusive)*

Translator's note:

For the sake of continuity and coherent explanation, most of the general discourse has been made by employing the 'male' as a prototype, which is in no way meant to be diminutive of opposite gender or to disrespect the status of women.

Moreover, each verse (Ayah) has been kept as a continuum in order to prevent the misrepresentation of meanings, which occur when the verses are broken up and the translation of the verses becomes kaput when done in bits and pieces.

Crossreferences taken from other parts of the Qur'an and the Hadith of the Messenger of Allah (SAAW) are provided in italics.

The Translation of the Holy Qur'an done by the Message International– USA (www.FreeQuran.com) and edited by Sah International– UK, Dar Al Mountada– Saudi Arabia and Al Qummah– Egypt has been used in order to synchronize the use of modern English Language, which we believe will give a more accomplished sense of understanding to Today's mind.

Recap of verses 20 – 34 of Surah 5, Al-Ma'idah

The reader would recall that we had concluded our exposition of verses 20 – 34 of Surah Al-Ma'idah in the previous issue of Hikmat e Qur'an. A brief recap of the exposition follows:

- 1- We saw that there are two main themes in verses 20 – 34 of the Surah:
 - a. Most of this passage (verse 20 – 34) of the Surah gives an account of the glory that the Israelites enjoyed before the time of Prophet Moses (AS), with Prophets of the stature of Abraham, Isaac, Jacob and Joseph (AS) appearing from amongst their ranks.
 - b. Towards the end of this passage (verses 20 – 34) of the Surah, we are told about the story of Abel and Cane, the two sons of Prophet Adam (AS).
- 2- From the time of Prophet Joseph (AS), the Israelites were able to achieve very considerable power and authority in Egypt. For a considerable period they were the greatest rulers of the civilized world, reigning supreme in Egypt and the surrounding territories. That was the truly glorious period of the history of the Israelites and Prophet Moses (AS) himself drew the attention of his people to that period as their time of splendour.

People are mistakenly inclined to regard the time of Moses (AS) as the starting point for the rise of the Israelites. In fact, the decline of the Israelites started with their exodus from Egypt towards the Holy Land (Palestine).

After their exodus from Egypt, Allah (SWT) ordered the Israelites to go forth to the Holy Land (Palestine) and conquer it. The previous verses, however, clearly demonstrate the degree to which the Israelites of that era were afraid of people occupying the Holy Land. Moreover, centuries of slavery in Egypt had made them coward and they were not willing to fight for the sake of Allah (SWT). Thus they turned towards Moses (AS) and said, somewhat sarcastically, that you (AS) and your (All-Powerful)

Allah (SWT) go and fight the war in the Holy Land and defeat the enemy. We will sit and wait until it is free from danger and only then will we enter the Promised Land. This answer also shows the lack of faith in Allah (SWT) among the Israelites that had been rescued by Prophet Moses (AS) from the worst kind of slavery in Egypt.

- 3- The verses also clarify that this led to Prophet Moses (AS) to make the supplication to Allah (SWT) to separate them (Moses and Aaron AS) from the transgressors.
- 4- The purpose of referring to these events becomes clear if we reflect upon the context. It clearly gives the message to the Israelites about the punishment to which they would be subjected if they adopted a rebellious attitude towards Prophet Muhammad (SAAW) and adds that it would be even more severe than the one to which they had been subjected during the time of Prophet Moses (AS).
- 5- Finally, the last few verses of the passage (20 – 34) details the story of Prophet Adam (AS) and his two sons, Abel (AS) and Cane, along with its logical moral.
- 6- The verses tell that when Allah (SWT) refused to accept the sacrifice of Cane, probably due to certain transgressions made by him or as a trial, instead of seeking for Allah's (SWT) forgiveness, he started to put blame on his brother (Abel) for his own shortcomings. Overcome by his personal rage (Id) and the whispers of Satan, he plotted against his brother (Abel) and subsequently murdered him.
- 7- In simple words, the story of Abel (AS) and Cane demonstrates that righteousness does not demand at all that when a man is subjected to wrongful aggression he should surrender to the aggressor rather than defending himself.

Righteousness, however, demands that a man should not take the initiative and try to kill someone even though he knows him to be bent on killing him. He should rather wait for the act of

aggression to be initiated by the other person. There is no concept of a 'Pre-emptive strike' in Islam! And this is exactly what was intended by the statement of the righteous son of Adam (AS).

- 8- Moreover, it indicates that the survival of human life depends on everyone respecting other human beings and in contributing actively to the survival and protection of others. Whosoever kills without righteousness is thus not merely guilty of doing wrong to one single person, but proves by his act that his heart is devoid of respect for human life and of sympathy for the human species as such. Such a person, therefore, is an enemy of all mankind.

This is so because he happens to be possessed of a quality which, were it to become common to all men, would lead to the destruction of the entire human race. The person who helps to preserve the life of even one person, on the other hand, is the protector of the whole of humanity, for he possesses a quality which is indispensable to the survival of mankind.

=====

Exposition of verses 35 to 50 of Surah Al-Ma'idah

Verse 35

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٣٥﴾

"Believers! Fear Allah and seek the means to come near to Him, and strive hard in His way; maybe you will attain true success."

In this verse Allah (SWT) commands His servants to obey Him sincerely and avoid everything which is against His Will or law and solicit all means which might bring them close to Him. Allah (SWT) has prescribed for us a number of types of 'means' to approach Him (SWT), the best of which (arguably) is to call upon Him (SWT) by means of His perfect Names such as when a Muslim says in his supplication: "O Allah (SWT) I ask You by your Mercy..., I ask You being the Most Gracious..." etc. The proof of this is in a part of the 180th verse of Surah Al-Aar'af as follows: "The most beautiful names belong to Allah, so call on Him by them..." (Surah 5: verse 180 part).

The English imperative 'strive hard' does not do full justice to the actual word used in the Qur'an: "jahidu". The verbal form "mujahadah" signifies and carries the nuance of doing something in defiance of, or in opposition to someone. The true sense of the Qur'anic injunction 'strive hard' in the way of Allah is that the Muslims ought to use all their strength and engage in vigorous struggle against those forces which either forcefully prevent them from living in obedience to Allah (SWT) or force them to live in obedience to others than Allah (SWT). It is this struggle which is likely to lead man to his true success and bring him to a close relationship with Allah (SWT), both in this life and in the Hereafter.

This verse directs the believer to engage in a ceaseless, multidimensional struggle. On one side is the accursed Satan with his horde. Then comes the animal spirit of man (*Nafs-e-Ammara*), with its defiant and refractory desires. Then there are many men who have turned away from Allah (SWT), but with whom one is linked by social, cultural and economic ties. Then there are false religious, political, economic, cultural and social systems which rest on rebellion against Allah (SWT) and which force man to worship falsehood rather than Truth. These rebellious forces use different means to achieve their end, but those ends are always the same - to make men serve them rather than Allah (SWT). But man's true progress and his attainment of close communion with Allah (SWT) depends entirely on his total obedience to Allah (SWT), on his serving Allah (SWT) unreservedly in the inner as well as in the external aspects of his life. He cannot achieve this objective without engaging in simultaneous combat with all the forces which are defiant and rebellious towards Allah (SWT), carrying on an unceasing struggle against them and trampling down all obstructions to his advancement along Allah's (SWT) path.

Verse 36

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ أَنَّ لَهُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّثْلَ مَعَةٍ لَيَفْتَدُوا بِهِ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَمَةِ مَا تُقْبَلُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝

"For those who disbelieved - even if they had all that is in the earth, and the like of it with it, and offered it all as ransom from chastisement on the Day of Resurrection, it will not be accepted of them - a painful chastisement lies in store for them."

This verse unveils the actual reality of this world and its 'treasures', which amount to nothing as compared to the blessings of the Hereafter. Thus on the Day of Judgment, no amount of ransom will be accepted from the unbelievers in exchange for exonerating them from the grievous punishment of the Hellfire, even if they bring this earth full of gold or twice as much.

Verse 37

يُرِيدُونَ أَنْ يُخْرِجُوا مِنَ النَّارِ مَاهُمْ يُخْرِجُونَ مِنْهَا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ۝

"They will wish to come out of the Fire, but they will not. Theirs will be a long-lasting chastisement."

This verse is an addendum to the previous one and it further clarifies that the unbelievers will never be able to escape the torment of Hellfire and they will be forced to abide in it eternally.

Verse 38

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝

"As for the thief - male or female - cut off the hands of both. This is a recompense for what they have done, and an exemplary punishment from Allah. Allah is All-Mighty, All-Wise."

A genuine Islamic Welfare state has an obligation to protect the essentials for living a normal and honourable life and ensure that they remain intact for its citizens. Islam protects these essentials of life and safeguards them from the transgressors by means of the punishments which Allah (SWT) has prescribed to attain peace and security in the society in general. This verse refers to the punishment ordained by Allah (SWT) for anyone proven guilty of theft.

The injunction is to cut off one hand (not both) of the one found guilty of the sin 'theft' in a court of law, irrespective of the gender or the social status of the convict. There is consensus among jurists that in the event of the first theft the right hand should be cut off. This

punishment has been laid down for theft alone and not for any other dishonest practice, as declared by the Prophet (SAAW) in several Ahadith. (Ref: Abu Da'ud, Tirmidhi, Ibn Majah, Nasa'i) It is applicable only to acts involving the seizure, by stealth, of someone else's property.

Moreover, there are several other things and situations viz. theft stated in the Ahadith of the Prophet (SAAW), which would not necessitate the cutting off a hand. On these grounds and on the basis of certain decisions made by the rightly guided Caliphs (RA), the founders of the schools of Islamic Law have exempted certain things from the application of this penal injunction.

The verse also states that the application of this punishment (and others) ordained by Allah (SWT) act as a deterrent for others not to engage in such crimes.

Verses 39 and 40

فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ

"But he who repents after he has committed wrong, and makes amends, Allah will graciously turn to him. Truly Allah is All-Forgiving, All-Compassionate."

أَلَمْ تَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ يُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

"Do you not know that to Allah belongs the dominion of the heavens and the earth? He chastises whom He wills and forgives whom He wills. Allah is All-Powerful."

These two verses should be read and explained together as the subject matter of both these verses is similar.

Forgiveness on the part of Allah (SAAW) does not mean that the hand of the thief should not be cut off. It means rather that one who repents and becomes righteous by purging his soul of the sin of stealing will be spared the wrath of Allah (SWT), and He (SWT) will remove the stain of that sin from him (and not hold the thief accountable in the Hereafter). However, in the case that even after the hand of a thief has been cut off, yet he does not purge himself of the evil intent of stealing and continues nurturing this impure feeling, it would signify that

'stealing' still remains ingrained in his soul. As a consequence, he would continue to merit Allah's (SWT) wrath in the same way as he used to before his hand was cut off. The Qur'an therefore directs the thief to seek pardon from Allah (SWT) and try to reform himself, because the hand of that thief was cut off for the sake of the judicious administration of human society and the cutting off of a hand did not automatically purify the soul of the person on whom the punishment was carried out. Purity of soul can be achieved only by repentance and turning oneself to Allah (SWT). Traditions mention that after the hand of a thief had been cut off in compliance with the Prophet's (SAAW) order, he was summoned by the Prophet (SAAW) himself. The Prophet (SAAW) said to him, "Say: 'I seek pardon from Allah (SWT), and to Him (SWT) do I turn in repentance.'" The thief uttered these words as directed by the Prophet (SAAW) who then prayed for the thief, saying: 'O Allah (SWT), accept his repentance.' (Ref: Abu Da'ud)

The bottom line is that Allah (SWT) is All-Powerful to punish whom He wills, All-Wise to know what is best for humans; yet at the same time Kind and Merciful to His (SWT) servants who follow the Ordained Law and repent after committing a sin.

Verse 41

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ لَا يَحْزَنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِينَ قَالُوا آمَنَّا بِأَقْوَاهِمُمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوبُهُمْ وَمِنَ الَّذِينَ هَادُوا سَمْعُونُ لِلْكَذِبِ سَمْعُونُ لِقَوْمٍ آخَرِينَ لَمْ يَأْتُواكَ بِكَلِمَةٍ بَعْدَ مَوَاضِعِهِ يَقُولُونَ إِنْ أُوتِينَا هَذَا فَخُدُودُهُ وَإِنْ لَمْ تُؤْتُوهُ فَأَحْذَرُوا وَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ فِتْنَتَهُ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا أُولَئِكَ الَّذِينَ لَمْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يُصْهِرْ قُلُوبَهُمْ طَاهَرٌ فِي الدُّنْيَا خُزِّيْ ۖ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ

"O Messenger! Do not be grieved on account of those who vie with one another in disbelieving: even though they be those who say with their mouths: 'We believe' even though their hearts have no faith; or they be Jews who have their ears eagerly turned to falsehood and spy for other people who have not come to you. They pervert the words of Allah, taking them out of their proper context in order to distort their meaning. They say to people: 'If such and such teaching is given to you, accept it; if you are not given that,

then beware! You can be of no avail to him whom Allah wills to fall into error. Those are the ones whose hearts Allah does not want to purify. For them there is degradation in this world and a mighty chastisement in the Next."

This verse refers to those who devoted all their capacities and efforts to ensure that the status quo ante of "jahiliyah" remained intact, and that the reformative mission of Islam should fail to set right the corruption that had come down to them from the past. Disregarding all moral scruples, these people used the vilest methods against the Prophet (SAAW). They deliberately suppressed the truth and resorted to lying, deceit, treachery and low cunning in order to frustrate the mission of the Prophet (SAAW) who was engaged in a tireless struggle actuated by absolute selflessness and benevolence, and who sought the welfare of all human beings, including that of his opponents. All this naturally hurt the Prophet (SAAW). A sincere person must feel heartbroken when he sees men of low moral character, driven by ignorance, blind selfishness and bigotry, resort to vile methods in opposition to his mission, which is actuated by charity and goodwill towards all men. Hence the purpose of Allah's (SWT) directive here is not to ask the Prophet (SAAW) to abstain from this natural feeling of grief but rather that he should not allow such feelings to undermine his morale and that he should persevere in his task. As for the opponents of the Prophet (SAAW), in view of their low morals, their mean conduct was not at all contrary to expectations.

The verse further explains the reasons of such behaviour shown by them (mostly the Jews and in some cases the Hypocrites). First, that since such people are slaves to their desires they cannot have the least interest in the Truth, falsehood alone gratifies them. It is with falsehood alone that they like to fill their ears, for nothing else quenches the thirst of their souls. Second, it is the same love of falsehood which motivates them when they come and spend some time in the company of the Prophet (SAAW) and the Muslims. They want to distort whatever they see or hear, to taint the facts with their fabrications, and then circulate them among those who have had no

contact with the Prophet (SAAW) and the Muslims in order to scandalize them.

The verse also details the *modus operandi* of these wicked people (mostly Jews). Firstly, they socialized with the Prophet (SAAW) and the Muslims in order to pry into their affairs and communicate what they find to the enemy. Secondly, they went about collecting information to try to slander them. Their objective was to create misgivings about the Prophet (SAAW) and the Muslims among those who were unacquainted with them. The Jews deliberately tampered with those injunctions of the Torah that did not accord with their desires, and by altering the meanings of the words occurring in the text they deduced laws that suited their interests. They also went about telling the ignorant masses that they should follow the teachings of the Prophet (SAAW) only if they conformed to the teachings of the (tampered) Torah.

Allah's (SWT) will to put someone to the test means that Allah (SWT) confronts one in whom He sees the growth of evil with the opportunities of doing just that, so that he experiences the struggle between good and evil. If the person is not yet fully inclined towards evil, his moral health improves and his latent potentialities for resisting evil are revived. But if he has become excessively inclined towards evil, and goodness has been totally crushed from within his being, then every such test is bound to entangle him still more tightly in evil. The well-wisher is now powerless to rescue him. It might be added here that not only individuals but also nations are put to this kind of test.

Lastly, it is not Allah's (SWT) way to deprive of purity those who love it and strive for it; but Allah (SWT) does not will to purify those who do not seek their own purification.

Verse 42

سَمْعُونَ لِلْكَذِبِ أَكْثُونَ لِلشَّعْيِ ۖ فَإِنْ جَاءُوكَ فَاحْكُم بَيْنَهُمْ أَوْ أَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَإِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَصُدُّوكَ شَيْئًا
وَأَنْ حَكَمْتَ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۝

"They are listeners of falsehood and greedy devourers of unlawful earnings. If they come to you, you may either judge between them

or turn away from them. And were you to turn away from them they shall not be able to harm you; and were you to judge between them judge with justice. Surely Allah loves the just."

This verse was revealed at the time when the Jews had not yet become full-fledged subjects of the Islamic state of Madinah. Their relations with that state were based on agreements according to which the Jews were to enjoy internal autonomy, and their disputes were to be decided by their own judges and in accordance with their own laws. They were not legally bound to place their disputes either before the Prophet (SAAW) for adjudication or before the judges appointed by him. But in cases where it appeared against their interests to have their disputes judged according to their own religious law they approached the Prophet (SAAW) in the hope that the Prophet (SAAW) might have a different ruling, 'suitable' for them.

The particular case referred to here was that of a woman belonging to a respectable family, who was found to be involved in an unlawful sexual relationship with a man. The punishment for this in the Torah was that both be stoned to death (*Ref: Deuteronomy 22: 23-4*). But the Jews did not want to enforce this punishment. Hence they deliberated among themselves and decided to put the case before the Prophet (SAAW), with the reservation that his judgement be accepted only if it was other than stoning. The Prophet (SAAW) decided that the punishment should, in fact, be stoning. When the Jews declined to accept the judgement, the Prophet (SAAW) asked their rabbis what punishment had been prescribed for such a case in their religion. They replied that it was to strike the culprit with lashes, to blacken the face and to make the person concerned ride on a donkey. The Prophet (SAAW) asked them again under oath if the Torah had indeed prescribed that as punishment for adultery committed by married men and women. They repeated the same false reply. However, one of them called Ibn Sawriya who, according to the Jews themselves, was the greatest living scholar of the Torah at that time, kept silent. The Prophet (SAAW) asked him to state on oath in the name of Allah (SWT), Who had emancipated them from Pharaoh and had given them the Law, whether the punishment for adultery provided for in the Torah was what they had mentioned. He replied: 'Had you not

put me under such a heavy oath, I would not have volunteered the correct information. The fact is that the prescribed punishment for adultery is indeed stoning, but when adultery became common among us our rulers adopted the rule that when respectable people committed adultery they were left unpunished, whereas when ordinary people were convicted they were punished by stoning. Later on when this caused resentment among the common people we altered the law of the Torah and adopted the rule that adulterers and adulteresses would be lashed, their faces would be blackened, and they would be made to ride on donkeys, seated in a backward-looking position.' This left the Jews with nothing to say and the adulterer and adulteress were, in accordance with the order of the Prophet (SAAW) and the true law of the Torah in such cases, stoned to death. (Ref: Tafsir of Ibn Kathir)

A briefer version of the same event is also mentioned in a hadith (Ref: Bukhari)

[Translator's Note: The verse makes a pointed reference to the judges and the jury-consults who accept false evidence and invent reports in order to issue verdicts contrary to justice and in favour of either those who bribe them or with whom their illegitimate interests lie.]

Verse 43

وَكَيْفَ يُحْكُمُونَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرَةُ فِيهَا حُكْمُ اللَّهِ ثُمَّ يَتَوَكَّلُونَ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَمَا أُولَئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ

“Yet how will they appoint you a judge when they have the Torah with them, wherein there is Allah's judgement - and still they turn away from it? The fact is, they are not believers.”

In this verse, Allah (SWT) unmasks completely the dishonesty of these people (the Jews and their rabbis). It shows how these so-called religious people who had cast the spell of their religious piety and knowledge of the Scriptures over the whole of Arabia had set aside a categorical injunction of the book which they themselves recognized to be the Book (Torah) of Allah (SWT), and which they professed to believe in. They had referred that judicial case to the Prophet (SAAW) for his decision even though they vehemently denied his status as a Prophet (SAAW) of Allah (SWT). This made it quite clear that there was nothing to which they subscribed sincerely. Their true religion

consisted merely of worshipping their interests and desires. They were ready to turn their backs upon the very book which they recognized as the Book (Torah) of Allah (SWT) merely because some of its injunctions were unpalatable to them, and in such cases they did not mind approaching one whom they regarded as an imposter (may Allah (SWT) be our refuge from such a blasphemy) in the hope that they might be able to obtain a judgement to their liking.

Verse 44

إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُخْفِطُوا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِي وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا وَمَنْ لَمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ﴿٤٤﴾

“Surely We revealed the Torah, wherein there is guidance and light. Thereby did Prophets - who had submitted themselves (to Allah) - judge for the Jews; and so did the scholars and jurists. They judged by the Book of Allah for they had been entrusted to keep it, and bear witness to it. So (O Jews!) do not fear men but fear Me, and do not barter away My signs for a trivial gain. Those who do not judge by what Allah has revealed are indeed the unbelievers.”

The verse clearly educates the Jews by telling them that all the Prophets (AS) were Muslims (submitters to Allah (SWT)) whereas the Jews had deviated from Islam (submission to Allah (SWT)), and true to their chauvinistic sectarianism and blatant racism, were content with remaining merely 'Jews' as a nation rather than the followers of a religion.

From the contextual point of view of the language, the word “Rabbani” refers to religious scholars and theologians, while “Ahbar” refers to religious jurists.

In the verse Allah (SWT) praises the Torah, which He (SWT) revealed to Prophet Moses (AS) for the Israelites. It contained the guidance and the light from Allah (SWT) to take them out of the darkness of ignorance and show them the right path. All the Prophets (AS) sent to the Children of Israel followed the laws of Torah by which they judged the Jews and they did not deviate from the straight path. They always submitted themselves to the Will of their Lord (SWT). Not

only the Prophets (AS) but also the Rabbis and their Jurists of that time judged according to the laws of Torah. They were entrusted with its protection and to be the witnesses of its truth and to testify that they had made it known to the people.

In short, Allah (SWT) had commanded the Israelites to fear Him alone and not to distort or conceal what He (SWT) had revealed to them in fear of other men or to suit their own desires.

The verse also applies to those Muslims who do not follow the Qur'an (and Sunnah) and do not judge their matters accordingly. It concludes by declaring that those who judge or rule according to what Allah (SWT) has revealed are Muslims and those who do not judge or rule according to what Allah (SWT) has revealed and distort Allah's (SWT) revelations then they are Kafirun (disbelievers).

[Translator's Note: Unfortunately, there is not a single Muslim country on the face of this earth today that judges or decides its matters solely according to what Allah (SWT) has revealed.]

Verse 45

وَكُنِبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۖ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ ۖ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ ۖ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ ۖ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۖ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ۖ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَهُ ۖ وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٤٥﴾

"And therein We had ordained for them: 'A life for a life, and an eye for an eye, and a nose for a nose, and an ear for an ear, and a tooth for a tooth, and for all wounds, like for like. But whosoever waives the right thereto, it will be for him an expiation. Those who do not judge by what Allah has revealed are indeed the wrong-doers.'"

This verse indicates that Allah (SWT) had ordained the law of retribution in the Torah, almost similar to as it is in Islam, but the Jews defied the ruling and refused to accept the divine commandments. The verse is still present in the Torah today as, "But if there is harm, then you shall pay life for life, eye for eye, tooth for tooth, hand for hand, foot for foot, burn for burn, wound for wound, stripe for stripe." (Ref: Exodus 21: 23-25)

However, Allah (SWT) has also given the option to the one harmed to relinquish his right of retaliation and says that if he does so, it is a

very noble deed which will atone for many of his sins. The same is confirmed by a tradition of the Prophet (SAAW) in which he said: 'Whoever receives an injury on his body, then pardons (the inflictor of the injury), his sins are atoned for to the measure of his pardoning.' (Ref: Musnad Ahmad bin Hanbal)

The final part of this verse refers to the Jews who do not follow Allah's (SWT) commandments and give false judgments. They only follow their lusts and desires and do not judge their matters according to what Allah (SWT) has revealed to His Messengers (AS). Thus Allah (SWT) says that they are unjust and evildoers.

Verse 46

وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ ۚ وَآتَيْنَاهُ الْإِنْجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ ۚ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ وَهُدًى وَنُورٌ ۚ وَلَمَّا بَيَّنَّ يَدِيهِ مِنَ التَّوْرَةِ وَهُدًى وَنُورٌ ۚ وَلَمَّا بَيَّنَّ يَدِيهِ مِنَ التَّوْرَةِ وَهُدًى وَنُورٌ ۚ

“And We sent Jesus, the son of Mary, after those Prophets, confirming the truth of whatever there still remained of the Torah. And We gave him the Gospel, wherein is guidance and light, and which confirms the truth of whatever there still remained of the Torah, and a guidance and admonition for the Allah (SWT)-fearing.”

In the continuous chain of the Prophets sent to the Children of Israel, Jesus (AS) the son of Mary (AS), was the last one. He was sent to confirm and verify the truth of Torah and rule by its laws. Allah (SWT) gave him the Gospel (Injeel, the Book of Allah SWT) which also contained guidance and light to direct people towards the right path. It was a guidance and admonition for the pious and the righteous and it came verifying the truth of the previous Scriptures, like the Torah. Jesus (AS) himself said that he had not come to abrogate the Torah, but to further develop it by going to the spirit of its substance and to get at its essence.

In essence, the Messiah (AS) did not expound a new religion. That very religion which had been the religion of all the Prophets (AS) was also his religion, and it is towards that religion that he called people.

The Qur'an repeatedly stresses the fundamental fact that none of the Prophets (AS) of Allah (SWT), no matter in which part of the world

they appeared, denied the Prophets (AS) who had preceded them. On the contrary, each Prophet (AS) confirmed the message of his predecessors and sought to promote the mission which was the sacred legacy of them all (AS). Similarly, it follows that Allah (SWT) did not reveal any of the Books in order to repudiate the previous ones; each confirmed and supported the preceding ones.

Verse 47

وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الْإِنجِيلِ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فِيهِ ۖ وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝

“Let the followers of the Gospel judge by what Allah has revealed therein, and those who do not judge by what Allah has revealed are the transgressors.”

The verse starts by warning the Christians to judge according to what Allah (SWT) has revealed to them, and believe in all that is present therein including the coming of the Allah's Last Messenger (SAAW) with His Last and final revelation i.e. the Qur'an.

It may appear that the verse specifically refers to the Christians who rebelled against and abandoned the truth that Allah (SWT) had revealed to them through Prophet Jesus (AS). However, the verse does not only apply to the Christians or the Jews, but to any one, a Muslim or a non-Muslim, who does not submit himself totally to the authority of Allah (SWT) and abandons the truth.

Moreover, the verse submits a three-in-one decree against those who do not judge in accordance with the Law revealed by Allah (SWT). The first is that they are “kafir” (unbelievers); the second, that they are “zalim” (wrong-doers/oppressors); and the third, that they are “fasiq” (transgressors). This clearly means that one who, in disregard of Allah's (SWT) commandments and of the Laws revealed by Him, pronounces judgements according to man-made laws (whether made by himself or by others) is guilty of three major offences. First, his act amounts to rejecting the commandment of Allah (SWT), and this rejection is equivalent to “kufr” (infidelity, unbelief). Second, his act is contrary to justice, for only the laws made by Allah (SWT) are in complete accord with the dictates of justice. Any judgement in contravention of Allah's (SWT) injunctions amounts, therefore, to

committing "zulm" (injustice/oppression). Third, when he enforces either his own or anyone else's law in disregard of the Laws of his Lord (SWT) he steps out of the fold of subjection and obedience, and this constitutes "fisq" (transgression).

The act of becoming a disbeliever, a wrongdoer or a transgressor, however, may vary depending on the degree of his disobedience.

Verse 48

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيِّمًا عَلَيْهِ فَاحْكُم بِنُورِهِ ۖ إِنَّا أَنزَلْنَا اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۚ لِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شُرْعَةً وَمِنْهَا جَاۓ ۚ وَكَوَشَاءَ اللَّهُ بَعَلِّكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ۚ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ۝

"Then We revealed the Book to you (O Muhammad!) with Truth, confirming whatever of the Book was revealed before, and protecting and guarding over it. Judge, then, in the affairs of men in accordance with the Law that Allah has revealed, and do not follow their desires in disregard of the Truth which has come to you. For each of you We have appointed a Law and a way of life. And had Allah so willed, He would surely have made you one single community; instead, (He gave each of you a Law and a way of life) in order to test you by what He gave you. Vie, then, one with another in good works. Unto Allah is the return of all of you; and He will then make you understand the truth concerning the matters on which you disagreed."

This verse points to a fact of major significance. It could also have been said that the Qur'an confirms all those parts of the earlier divine books which are still extant in their true and original form. But the sense has been conveyed by employing the word 'the Book' rather than 'the previous Books'. This expression reveals that the Qur'an and all those Books sent down by Allah (SWT) at various times and in different languages in reality constitute one and the same Book. Their Author (SWT) is one and the same; their aim and purpose are the same; their teaching is the same; and the knowledge which they seek to impart to mankind is the same. The difference between these Books lies in their modes of expression, and this was necessarily so since they were addressed to different audiences. It is, therefore, not merely

that these divine books support rather than contradict each other but that they are actually different editions of one and the same book - 'the Book'.

In Arabic, the root "haymana" signifies 'to protect, to witness, to keep trust, to back and to support'. To say that the Qur'an is "muhaymin" of "al-kitab" means that it preserves all the true teachings of the earlier divine books; that it has secured them from loss. The Qur'an also confirms those Books in that the contents of the Qur'an testify to the truth of those parts which are indeed from Allah (SWT). The Qur'an is, further, a witness over those Books in the sense that, with its help, the elements which embody true revelations from Allah (SWT) can be distinguished from the accretions which have corrupted them. Whatever in these Books accords with the Qur'an is from Allah (SWT), and whatever is not in conformity with it is from human beings.

The part of verse where, apparently, a Will of Allah (SWT) is described regarding difference of creation is, in fact, a parenthetical phrase, the purpose of which is to elucidate a question which is likely to arise in the mind of the reader who has read the above section and might feel uneasy. The question is: Why do the religious laws propounded by the various Prophets (AS) differ in matters of detail even though the Prophets (AS) and their Books preach one and the same religion (Deen) and even confirm and support each other? Why is it that in regard to the prescribed forms of worship, the regulations concerning what is permitted and what is prohibited, and the detailed legal regulations governing the social and collective life, there is some (apparent) disagreement among the various laws propounded by the different Prophets (AS) and the divine Books?

Answer to such questions requires detail and the final part of the verse serves this purpose by elaborating the following points:

(1) It is a mistake to think that variations in religious laws result from a difference of source. It is Allah (SWT) Himself Who altered the legal prescriptions to suit different nations at different times and in different circumstances.

(2) It was indeed possible, by devising one legal code for all human beings, for all men to have been made into one nation (Ummah). But

one of the many benevolent considerations keeping the religious laws of various Prophets (AS) different from one another was that Allah (SWT) wanted this difference to become a means of testing people. Those who understand true religion, who have grasped its spirit and essence, and who are aware of the true importance of the different legal prescriptions, always recognize the Truth and accept it whatever its form. They have no hesitation in accepting the new ordinances of Allah (SWT) in place of the old ones, in contrast to those who are not conversant with the spirit of true religion and who seem to identify it with a specific body of legal minutiae. Such people have overlaid the principles ordained by Allah (SWT) with their own legal deductions, and have subsequently fossilized this entire amalgam, seeking to preserve it in its entirety. They have grown so attached to it that, in order to preserve it, they spurn every directive which subsequently comes to them from Allah (SWT). In order to distinguish the people of the first category from those of the second, Allah (SWT) made the legal prescriptions of the various Prophets (AS) vary.

(3) The real purpose of all the divine religious laws is the attainment of goodness and righteousness. This purpose can be achieved only when a man obeys whatever commandment he receives from Allah (SWT) at a particular time. The proper mode of conduct for people who keep their eyes fixed on this true purpose is to strive for Allah's (SWT) pleasure rather than quarrel about differences in the legal prescriptions of the various Prophets (AS).

(4) The differences which have arisen because of the unjustified rigidity, prejudice, obduracy and erroneous attitudes of the human mind can be finally settled neither in the debating hall nor on the battlefield. The final judgement will be made by Allah (SWT) Himself. Then the reality of everything will be fully uncovered, and it will be clear how much truth and falsehood underlay the squabbles over which whole lives were wasted.

Verse 49

وَأَنِ احْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ أَنْ يَفْتِنُوكَ عَنْ بَعْضِ مَا أَنزَلَ اللَّهُ إِلَيْكَ ۖ فَإِنْ تَوَلَّوْا
فَاعْلَمُوا أَنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُصِيبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوبِهِمْ ۖ وَإِنْ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ لَفَاسِقُونَ ﴿٤٩﴾

"Therefore, judge between them (O Muhammad!) by what Allah has revealed and do not follow their desires, and beware lest they tempt you away from anything of what Allah has revealed to you. And if they turn away, then know well that Allah has indeed decided to afflict them for some of their sins. For surely many of them are transgressors."

Following the parenthetical clause of the previous verse, the subject in the initial part of verse 48 is resumed here, with the method of doing Justice among people repeated at the start of this verse for emphasis of the command.

This verse also tells the Prophet (SAAW) to beware of the Jews who were always in search of an opportunity to deceive him and wished to turn him (SAAW) away from the truth. The audience of this verse are Muslims in general too, as the next part of the verse warns that if ordinary Muslims disbelieve, it is Allah's (SWT) Will to deviate them from the truth and scourge them for some of their sins.

Verse 50

أَتَحْكُمُ الْجَاهِلِيَّةَ يَبْغُونَ ط وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ ۖ

"(If they turn away from the Law of Allah) do they desire judgement according to the Law of Ignorance? But for those who have certainty of belief whose judgement can be better than Allah's?"

The word "jahiliyah" (literally 'ignorance') is used in this verse as an antonym to Islam. Islam is the way of "ilm" (true knowledge), since it is Allah (SWT) Himself Who has shown this way, and His (SWT) knowledge embraces everything. In contrast is the way that diverges from Islam – the path of Ignorance ("jahiliyah").

The pre-Islamic period in the Arabian Peninsula is designated as "the age of ignorance" (Dor-e-jahiliyah) because this was the era when human beings derived their norms from either superstitious beliefs, conjecture, imagination or from their personal desires. Whenever such an attitude is adopted, it is bound to be designated as Ignorance. The appellation "jahiliyah" will apply to every aspect of life which is developed in disregard of the knowledge made available by Allah (SWT), based only on man's partial knowledge blended with imagination, superstitious fancies, conjectures and desires.

Allah (SWT) is the Creator of mankind and He (SWT) has the perfect knowledge of everything. Therefore those who are enlightened by His (SWT) blessing with "ilm" (true knowledge) know as a certainty that Allah (SWT) knows best what is beneficial for humans and what is harmful to them.

=====

And Allah (SWT) Knows Best!

- ✽ قربانی ہماری معاشرتی رسم ہے یا دینی فریضہ؟
- ✽ قرآن و سنت کی روشنی میں قربانی کا فلسفہ کیا ہے؟
- ✽ عید الاضحیٰ اور قربانی میں باہم چولی دامن کا ساتھ کیوں ہے؟
- ✽ حج کے موقع پر منیٰ میں کی جانے والی قربانی اور اس موقع پر پوری دنیا میں کی جانے والی قربانی میں کیا ربط و تعلق ہے؟

ان سوالات کی وضاحت کے لیے مطالعہ کیجئے:

عید الاضحیٰ اور فلسفہ قربانی

دور
حج اور عید الاضحیٰ اور اُن کی اصل روح
قرآن حکیم کے آئینے میں

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر **الرحمہ اللہ** محمد عبد اللہ

کی ایک تقریر اور ایک تحریر پر مشتمل مختصر مگر جامع کتابچہ

☆ 56 صفحات ☆ قیمت (اشاعت خاص) 50 روپے
(اشاعت عام) 30 روپے

36- کے ماڈل ٹاؤن لاہور
مکتبہ خدام القرآن لاہور فون 35869501-03

maktaba@tanzeem.org

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبع ایمان — اور — سرچشمہ یقین

قرآن حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانی — اور — اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

یہ کام امت کے فیہم غرض میں تجرید ایمان کی ایک عمومی تحریک یا ہوجائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃ ثانیہ — اور — غلبہ دین حق کے دور ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ